جميع الحقوق محفوظة بحقّ المؤلّف

اسم الكتاب : ....

اَهْلُ الْقُرْآنِ و رِجَالُ الْقُرْآنِ..................----------------

تأليف : ....

فضيلة الشيخ رضآء الله الباجوري

الطبع :..............................

الثانى سنة ١۴۴۶هـ

النّاشر : ..... مدرسة ترتيل القرآن شانرے باجور باكستان

پیش لفظ

صحابہ ؓکرام کا عہد زریں بڑے دلچسپ اور سبق آموز واقعات پر مشتمل ہے۔ اُن کی عطر آگیں سیرت اور پاکیزہ زندگی ایمان و عمل کا بہت بڑا سرچشمہ اور منبع نور وہدایت ہے، جس سے مسلمانوں نے ایمان ویقین کی مشعلیں روشن کی تھیں اور جس کے ایندھن سے آتش دانِ دل کو مدتوں سلگائے رکھا تھا۔ خلفائے راشدین کی قابل فخر تاریخ ایمان وایقان، صبر و تحمل، بے پناہ شجاعت، ثابت قدمی اور علم وہنر کے کارہائے نمایاں سے بھرپور ہے۔

ان کا بے مثال عمل و کردار جس کے ثمرات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کا فیضان آج تک جاری ہے، یہی تھا کہ وہ لوگوں کے معاملے میں خداترس واقع ہوئے تھے۔ دنیا کے مال ومتاع سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ خشوع و خضوع کے پیکر تھے اور اللہ تعالیٰ سے ان کا تعلق بڑی مستحکم بنیادوں پر استوار تھا۔ اس تعلق کو منقطع کرنا انھیں ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہیں تھا۔

حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم یہ چاروں اصحاب خلفائے راشدین کے بلند وبالا لقب سے پہچانے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو وصیت کی تھی کہ یہ چاروں جس راہ پر قدم

بڑھائیں، تم بھی اُسی راہ کو اختیار کرنا اور انھی کے منہج وفکر کو اپنا نصب العین قرار دینا۔ آپ نے ارشاد فرمایا تھا:

((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ، تَمَسَّكُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ))

"میری سنت اور میرے خلفاء کی سنت اپنائے رکھنا، جو اصحابِ رشد وہدایت ہیں۔ اسے مضبوطی سے تھامنا اور ڈاڑھوں سے پکڑ لینا۔" [1]

ایک موقع پر فرمایا:

((إِنِّي لَا أَدْرِي مَا بَقَائِي فِيكُمْ، فَاقْتَدُوا بِالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِي))

"بے شک میں نہیں جانتا کہ تم میں کب تک رہوں گا، چنانچہ اُن لوگوں کی پیروی کرنا جو میرے بعد ہوں گے۔" یہ کہہ کر آپ نے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی طرف اشارہ کیا۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چاروں اصحاب کا فرداً فرداً تذکرہ بھی کیا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

((لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذاً خَلِيلًا لَا تَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ خَلِيلًا)) "اگر میں کسی کو خلیل (جانی دوست) بنایا کرتا تو ابو بکر کو خلیل (جانی دوست) بناتا۔" [3]

اَهْلُ الْقُرْآنِ و رِجَالُ الْقُرْآنِ

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

[1]سنن أبي داود، حديث: 4607- [2] جامع الترمذي، حديث: 3663- [3] صحيح مسلم، حديث: 2383 اور ديكهيے صحيح البخاري، حديث: 467-

((يَا ابْنَ الْخَطَّابِ! وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، مَا لَقِيَكَ الشَّيْطَانُ سَالِكًا فَجًّا قَطُّ إِلَّا سَلَكَ فَجًّا غَيْرَ فَجِّكَ))

"ابن خطاب! اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، شیطان تم سے جس راہ میں بھی چلتے ملے گا، تمھاری راہ چھوڑ کر ہمیشہ دوسری راہ لے گا۔" [1]

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

((أَشَدُّ أُمَّتِي حَيَاءً عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ)) "میری امت میں سب سے زیادہ حیادار عثمان بن عفان ہے۔" [2]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ((أَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسٰى))

"تمھارا مرتبہ میرے ساتھ وہی ہے جو ہارون (علیہ السلام) کا موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ تھا۔" [3]

ہمارے اسلاف میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بلند ترین حیثیت کے مالک ہیں۔ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں علم و عمل کے اعتبار سے خلفائے راشدین سرفہرست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان پاکباز ہستیوں کی درخشاں سیرت کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کتاب کی تحریر کا آغاز کیا ہے۔ امید ہے کہ خلفائے راشدین اور دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی معیت میں ہمارا یہ علمی و تاریخی مطالعہ ان شاء اللہ بڑا مبارک اور خوشگوار ثابت ہو گا۔

آدمی خوش رنگ و خوشنما پھولوں سے سجے باغ میں گھنے درختوں کے سائے تلے

[1]صحيح البخاري، حديث: 3683، صحيح مسلم، حديث: 2396- [2] صحيح الجامع الصغير، حديث : 1002- [3] صحيح مسلم، حديث : 2404-

چہل قدمی کرے اور باغ کی تازہ، ٹھنڈی اور نرم ہوا کا لطف اٹھائے تو دل کو کیسی خوشی ملتی ہے اور روح کس قدر معطر ہو جاتی ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مثالی سیرت اور ان کے حسنِ فکر کے مطالعے سے ان شاء اللہ ہمارے دل و دماغ کو بھی رہنمائی کی روشنی نصیب ہو گی۔ زیر نظر کتاب خلفائے راشدین کے علم و نظر، سیرت و کردار اور ان کے عظیم کارناموں کی روداد ہے۔ اس میں جہاں آپ کو خلفائے راشدین کی پاکیزہ سوانح عمری پڑھنے کو ملے گی وہیں اُن کے نورِ علم کی روشنیاں بھی جگمگاتی نظر آئیں گی۔ یہی نہیں، تجدید ایمان کا موقع بھی میسر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں علم نافع عطا کرے، جو علم عطا کیا ہے اس سے بھرپور استفادہ کرنے کی توفیق دے اور ہمارے علم میں اضافہ فرمائے، آمین۔

د۔ ابو عطاء المنعم رضاء اللہ بن الحاج خان بادشاہ حفظہ اللہ

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

مردوں میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سب سے پہلے ایمان لائے۔ آپ ہجرتِ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیقِ سفر تھے۔ بے کس غلاموں کو سردارانِ قریش کے پنجۂ استبداد سے چھڑاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد جب جزیرہ نمائے عرب کے بہت سے افراد مرتد ہوگئے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اُن کے خلاف عَلمِ جہاد بلند کیا اور انھیں اسلام کی طرف لا کے چھوڑا۔ وفاتِ نبوی کے بعد مسلمانوں کے پہلے خلیفہ آپ ہی تھے۔

رضی اللہ عنہ آپ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے والد گرامی ہیں۔ آپ کا نام عبد اللہ بن ابی قحافہ اور لقب صدیق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں عتیق کا لقب دیا۔ اس کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا کہنا ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کرام رضی اللہ عنہم گھر کے آنگن میں تشریف فرما تھے۔ میرے اور اُن کے درمیان پردہ حائل تھا۔ اتنے میں ابو بکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دیکھا تو فرمایا: ”جو شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھنا چاہے جو نارِ جہنم سے محفوظ ہے، وہ انھیں دیکھ لے۔“ [1]

اہل عرب کے ہاں علمِ انساب اور علمِ تاریخ کی بڑی اہمیت تھی۔ انساب میں اُن کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ آدمی تو آدمی ہیں، وہ گھوڑوں، اونٹوں تک کے نسب اور خاندانی سلسلے یاد رکھتے تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ آپ بھی بہت بڑے ماہر انساب تھے۔ حضرت عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ انساب کے مشہور عالم ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اِس فن میں اُن کے بھی استاد تھے۔ آپ کی اس خوبی کے متعلق خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا: ”اہل قریش میں قریش کے انساب کے سب سے بڑے عالم ابو بکر ہیں۔“ [1]

اسلام تو اسلام، دور جاہلیت میں بھی اُنھوں نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ جاہلیت میں آپ نے کبھی بادہ نوشی بھی کی تھی؟ فرمایا: ”اللہ کی پناہ۔“ پوچھا گیا کہ ایسا کیونکر ہوا۔ فرمایا: ”بھئی! میں تو اپنی عزت کو داغدار ہونے سے بچاتا اور اپنی آدمیت کی حفاظت کرتا تھا۔

جو آدمی پیتا ہے وہ عزت تو گنواتا ہی ہے، آدمیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔“ ان کی یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلی تو آپ نے فرمایا: ”ابو بکر نے بالکل درست کہا۔“ [2]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جاہلیت میں کبھی بتوں کی پوجا نہیں کی۔ ایک مرتبہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی محفل میں تشریف فرما تھے۔ کسی نے یہ موضوع چھیڑ دیا۔ آپ نے کہا: ”میں نے کبھی کسی بت کو سجدہ نہیں کیا۔ جب میں سن بلوغت کو پہنچا تو ایک روز والد محترم ابو قحافہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے بت کدے میں لے گئے۔ مجھ سے کہنے لگے: ”یہ ہیں تمھارے بلند مرتبہ معبود۔“

وہ مجھے بت کدے میں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔ میں ایک بت کے قریب گیا اور کہا: ''میں بھوکا ہوں۔ مجھے کھانا کھلاؤ۔ میرے پاس پہننے کو کچھ نہیں۔ مجھے پہننے کو کپڑے دو۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ایک بڑا پتھر اٹھایا اور اُسے کھینچ مارا۔ وہ منہ کے بل زمین پر جا رہا۔'' [1]

چہرہ مہرہ

سپید رو، نازک اندام، رخسار ہلکے، کمر قدرے جھکی ہوئی، دبلا پتلا چہرہ، آنکھیں گہری، پیشانی بلند، ہاتھ پاؤں بالوں سے عاری۔'' یہ تھے ہمارے ممدوح جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔[2]

اسلام کے زیر سایہ

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بتدریج اسلام کے شناسا ہوئے تھے۔ اُن کا اپنا بیان ہے کہ ایک روز میں کعبہ کے صحن میں بیٹھا تھا۔ زید بن عمرو بن نفیل بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ امیہ بن ابی صلت وہاں سے گزرا تو ٹھہر گیا۔ زید کو مخاطب کر کے کہنے لگا: ''خیر کے متلاشی! کہو، کیسے ہو؟''

زید نے جواب دیا کہ خیریت سے ہوں۔

''اور سناؤ، کچھ ملا؟''

''نہیں لیکن میں نے تلاش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔''

اِس پر امیہ نے کہا: ''روز قیامت تو سارے دین سوائے ایک دین کے جس کا اللہ نے فیصلہ کر رکھا ہے، بے کار ثابت ہوں گے۔ آگاہ رہنا، نبی منتظر یا تو ہمارے قبیلے کا ہو گا یا پھر تمھارے قبیلے کا۔''

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اِس سے پہلے مجھے معلوم نہیں تھا کہ کوئی نبی آنے والا ہے اور اُس کا انتظار بھی کیا جاتا ہے۔ میں اٹھا اور سیدھا ورقہ بن نوفل کے ہاں پہنچا۔ وہ اکثر آسمان کو گھورا کرتے تھے۔ رنج و غم کے مارے سینے میں دہاڑیں گونجا کرتی تھیں۔ حسن اتفاق سے راستے میں مل گئے۔ شاید کہیں جا رہے تھے۔ میں نے امیہ بن ابی صلت کی بات بتائی تو فرمانے لگے: ''ہاں، بھتیجے! اہل کتاب اور آسمانی کتابوں کا علم رکھنے والے تو یہی کہتے ہیں کہ نبی منتظر کا تعلق عرب کے سب سے بہتر خاندان سے ہو گا۔ میں عرب کے انساب سے واقف ہوں۔ میرے علم کی حد تک تمھارا خاندان ہی عرب کا سب سے بہتر خاندان ہے۔''

میں نے پوچھا: ''چچا! نبی کیا فرمائے گا؟''

بولے: "نبی وہی فرمائے گا جو اُس پر وحی کیا جائے گا۔ وہ ظلم نہیں کرے گا نہ ظلم کا بدلہ ظلم سے دے گا۔" چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو میں آپ پر بے چون وچرا ایمان لے آیا۔" [1]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مکہ کے باکمال تاجر تھے۔ تجارت کی غرض سے یمن اور شام جایا کرتے تھے۔ تجارت کے سفر سے انھوں نے خاصی دولت کمائی اور مردم شناسی کا جوہر بھی اُن میں پیدا ہوا۔

ایک مرتبہ سفر سے لوٹے تو قریش کا ایک آدمی راستے میں ملا۔ اُس نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا: "جی! سنتے ہو! تمھارے صاحب نے کیا کہا۔" "کیا کہا انھوں نے!"

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حیران ہو کر پوچھا: "اُس نے کہا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔" حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ یہ سن کر پہلے تو خاموش رہے، پھر فرمایا: "اگر انھوں نے یہ کہا ہے تو بلاشبہ سچ ہی کہا ہے۔" سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں پہنچے۔ پوچھا: "ابو القاسم! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟!"

"کیا سنا ہے آپ نے ابو بکر!؟"

"میں نے سنا ہے کہ آپ توحید الٰہی کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابو بکر! یہ بات درست ہے۔ میرے رب نے مجھے بشیر و نذیر بنایا ہے۔ اُس نے مجھے تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔"

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: واللہ! میں نے آپ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ بلاشبہ آپ رسالت کے مستحق ہیں۔ لائیے، اپنا ہاتھ دیجیے میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔"

یوں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ شرفائے عرب میں وہ پہلے آدمی تھے جو ایمان لائے۔ انھوں نے اسلام کے لیے اپنا دھن دولت، جان ومال سب کچھ پیش کر دیا۔ قبولِ اسلام کے بعد اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا کہ ہمیں بیت اللہ میں داخل ہو کر کھلے عام اسلام کی دعوت دینی چاہیے۔ آپ نے اجازت دی تو تمام مسلمان بیت اللہ میں گئے اور اعلانیہ اسلام کی دعوت دے ڈالی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تقریر کا آغاز کیا تو مشرکین مکہ اُن پر پل پڑے اور زدوکوب کرنے لگے۔ عتبہ بن ابی ربیعہ نے تو بدتمیزی کی حد کر ڈالی۔

اُس نے اپنا جوتا اتارا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے چہرۂ مبارک پر پے در پے کئی ضربیں لگائیں۔ چہرہ متورم ہو گیا۔ پہچانے نہیں جاتے تھے۔ بنو تیم جو آپ رضی اللہ عنہ کے اہل قبیلہ تھے، انھیں پتہ چلا تو وہ دوڑے آئے۔ مشرکین کو پرے ہٹایا اور آپ کو ایک چادر میں اٹھائے گھر لے آئے۔ چوٹیں

ایسی شدید تھیں کہ بنو تیم نے سمجھا آپ زندہ نہیں رہیں گے۔ انھوں نے مسجد میں اعلان کر دیا کہ اگر ابو بکر نے وفات پائی تو ہم عتبہ کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے۔ جب آپ ہوش میں آئے تو سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت دریافت فرمائی۔ قبیلہ والوں نے سخت سست کہا کہ اسی کی وجہ سے اس حال کو پہنچے اور ہوش میں آتے ساتھ ہی اسی کا حال پوچھتے ہو۔ اُن کی والدہ سے کہا کہ اسے کچھ کھلاؤ پلاؤ اور خود چل دیے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کس حال میں ہیں۔ والدہ نے جواب دیا کہ واللہ! مجھے تمھارے صاحب کے بارے میں کچھ علم نہیں۔

فرمایا: "بنت خطاب کی طرف جایئے۔ اُن سے پوچھ کر آیئے۔" وہ بنت خطاب کے ہاں گئیں۔ بنت خطاب کو خدشہ ہوا کہ کہیں یہ مشرکین کی جاسوس نہ ہو۔ انھوں نے کہا: "میں ابو بکر اور محمد بن عبد اللہ کو نہیں جانتی۔"

والدہ نے اُن کی منت سماجت کی کہ آپ میرے ساتھ چلیے اور ابو بکر سے خود بات کر لیجیے۔ ان کی حالت بہت نازک ہے۔ وہ تشریف لائیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اس حال میں دیکھا تو دل بھر آیا۔ بولیں: "جن لوگوں نے تمھارا یہ حال کیا ہے وہ یقیناً بد قماش ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن سے ضرور انتقام لے گا۔"

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لبوں پر ایک ہی سوال تھا: "

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟"

بنت خطاب ابھی تک خائف تھیں۔ بولیں: "

آپ کی والدہ سن رہی ہیں۔" فرمایا: "ان کے متعلق بے فکر رہیے۔"

بنت خطاب نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحیح سلامت ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہیں، انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ بنت خطاب نے بتایا کہ وہ ارقم بن ابی ارقم کے مکان پر ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے اُن کی خدمت میں لے چلو۔ میں انھیں دیکھ کر اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔

راستے خالی ہوئے اور لوگوں کی آمد و رفت تھمی تو دونوں خواتین حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سہارا دیے ہوئے روانہ ہوئیں۔ تینوں افراد دارِ ارقم میں داخل ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی یہ حالت دیکھی تو آپ کو شدید رقت ہوئی۔[1]

مکہ میں مسلمانوں کا عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہجرت حبشہ کی اجازت دی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی رختِ سفر باندھا اور حبشہ کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ راستے میں سید القارہ ربیعہ بن فہیم المعروف بہ ابن دغنہ سے ملاقات ہوئی۔ پوچھا: کہاں کا

ارادہ ہے۔ فرمایا: حبشہ جاتا ہوں۔ پوچھا: کاہے کو۔ فرمایا: تمھاری قوم نے جینا دوبھر کر دیا۔ ابن دغنہ نے کہا: نہیں ابو بکر! تم جیسے آدمی شہر چھوڑ کر نہیں جایا کرتے نہ انھیں شہر سے نکالا جاتا ہے۔ تم واپس چلو۔ اپنے شہر میں اپنے رب کی عبادت کرو۔ میں تمھیں پناہ دیتا ہوں ۔

مکہ پہنچ کر ابن دغنہ اشراف قریش سے ملا اور انھیں بتایا کہ اُس نے ابو بکر کو پناہ دی ہے۔ اشراف قریش نے اُس کی یہ بات تسلیم کی اور کہا کہ ٹھیک ہے، اس سے کہو، اپنے گھر میں اپنے رب کی عبادت کرے، وہیں نماز پڑھے اور جو چاہے قراءت کرتا رہے لیکن ہمیں ایذا نہ دے اور یہ کام اعلانیہ نہ کرے۔ ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہماری عورتوں اور ہمارے بچوں کو خراب کر دے گا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے گھر کے باہر آنگن میں جائے نماز بنائی۔ دن بھر وہیں بیٹھے نماز پڑھتے اور تلاوت کرتے رہتے۔ قریش کے نوجوان، عورتیں اور بچے اُن کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور بغور تلاوت سنتے۔ تلاوت اختتام پذیر ہوتی تو وہ لوگ گھروں کو چلے جاتے اور وہی باتیں دہراتے رہتے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے سن کر جاتے۔ قریش کے سرداروں کو یہ بات کہاں ہضم ہوتی۔ انھوں نے ابن دغنہ سے رابطہ کیا اور کہا کہ ابو بکر کو روکو ورنہ اُسے اپنی پناہ سے نکال دو۔ ابن دغنہ، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہاں گیا اور اُن سے کہا کہ یوں کھلے بندوں نماز پڑھنی اور قراءت کرنی چھوڑ دو ورنہ میں اپنی پناہ واپس لیتا ہوں۔

فرمایا: ”تم اپنی پناہ واپس لو۔ مجھے اللہ کی پناہ کافی ہے۔“ [1]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دعوت دین کا کام جاری رکھا۔ مکہ کے کئی سرداروں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ ان میں عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، طلحہ بن عبید اللہ، سعد بن ابی وقاص، عثمان بن مظعون، ابو عبیدہ بن جراح اور عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم جیسے نامی گرامی سردار شامل تھے۔ جو سردارانِ قریش مسلمان ہوئے تھے، وہ تو کسی طرح مشرکین مکہ کے قابو میں نہیں آئے، البتہ جو غلام مسلمان ہوئے، **ان بیچاروں** پر بڑا ظلم و ستم کیا گیا۔ موذنِ رسول حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ جو پہلے پہل غلام تھے، مسلمان ہوئے تو اُن کا آقا انھیں صحرا کی تپتی ریت پر لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھوا دیتا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھاری پتھر تلے دبے ہوئے بھی اَحد اَحد (اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے) پکارتے رہتے اور بالآخر بے ہوش ہو جاتے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو آپ نے اُنھیں سونے کی پانچ اشرفیوں کے عوض خریدا اور آزاد کر دیا۔ قریش کے ظالم سردار نے کہا کہ تم ایک اشرفی بھی دیتے تو ہم اسے بیچ ڈالتے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ تم سو اشرفی بھی طلب کرتے تو میں اسے خرید کر رہتا۔[1]

یوں اُنھوں نے کئی مجبور و مقہور غلام، جو مسلمان ہو چکے تھے، خرید خرید کر آزاد کیے۔ مشرکین مکہ نے سوچا کہ یہ تو گھاٹے کا سودا ہے۔ مسلمانوں کی تعداد تو برابر اسلام کی دعوت بھی بدستور جاری ہے۔ تو انھوں نے چراغِ نبوت گل کرنے کا گھناؤنا منصوبہ بنایا۔ اُدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذنِ ہجرت مل گیا۔

اَهْلُ الْقُرْآنِ و رِجَالُ الْقُرْآنِ

رفیق سفر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بیان کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز دوپہر کے وقت اُن کے گھر تشریف لائے۔ آپ عام طور پر اُس وقت نہیں آیا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ کو آتے دیکھا تو کہا کہ کوئی خاص بات ہے ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تشریف نہیں لایا کرتے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اندر تشریف لائے۔ کمرے میں حضرت ابو بکر، حضرت اسماء اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ آپ نے تشریف رکھتے ہی فرمایا کہ اہل خانہ کو باہر بھیج دیجیے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! فکر مت کیجیے یہ آپ ہی کا گھر ہے اور یہ میری بیٹیاں ہیں۔ ان کے سامنے آپ جو کہنا چاہیں، کہہ سکتے ہیں۔ اِس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذنِ ہجرت مل گیا ہے۔" عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا مجھے ہمراہی کا شرف حاصل ہو گا۔ فرمایا: ہاں۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ واللہ! اس سے پہلے مجھے نہیں پتہ تھا کہ خوشی کی وجہ سے بھی آنسو نکل پڑتے ہیں۔ اُس روز جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے والد محترم سے یہ فرمایا کہ ہاں، آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے تو والد محترم بے اختیار رو دیے۔ تب مجھے پتہ چلا کہ خوشی کی وجہ سے بھی آنسو نکل آیا کرتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! میرے پاس دو سواریاں ہیں جو میں نے اِسی وقت کے لیے تیار کر رکھی تھیں۔ عبد اللہ بن اُریقط کو راستے کے رہبر کے طور پر ساتھ لیا گیا اور اسے اِس کام کی اجرت دی گئی۔[1]

یوں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہمدمِ دیرینہ کے ہمراہ مدینہ ہجرت کی۔ مدینہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مؤاخات کا رشتہ قائم کر دیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا رشتۂ مؤاخات خارجہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کے ساتھ قائم ہوا۔ آپ نے خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ کے ہاں قیام کیا۔ انھوں نے اپنی بیٹی حبیبہ آپ کے عقد میں دے دی۔ خارجہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کا شمار کبار صحابہ میں ہوتا ہے۔ وہ غزوہ احد میں شہید ہوئے۔ انھیں صفوان بن امیہ نے اپنے باپ کے بدلے میں شہید کیا تھا۔ صفوان کے باپ امیہ کو خارجہ اور معاذ بن عفراء رضی اللہ عنہما نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی جان، مال اور زندگی اسلام کے لیے وقف کر دی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اُن کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

""ہم پر جس کسی کا بھی احسان تھا، اُسے ہم نے چکا دیا سوائے ابو بکر کے۔ اُن کا ہم پر جو احسان ہے اُسے روز قیامت اللہ تعالیٰ ہی چکائے گا۔ ابو بکر کے مال سے مجھے جتنا فائدہ پہنچا، اُتنا فائدہ مجھے کسی کے مال سے نہیں پہنچا۔ میں نے جسے بھی اسلام کی دعوت دی اُس نے پس و پیش کیا سوائے ابو بکر کے، ابو بکر نے بلا تردد اسلام کی دعوت قبول کی۔" [1]

ہجرت کے پانچویں برس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کرام رضی اللہ عنہم کو ساتھ لیے مکہ روانہ ہوئے۔ عمرے کا قصد تھا۔ قریش کو خبر ہو گئی کہ آپ مکہ کی طرف آ رہے ہیں۔ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر مکہ بھیجا تاکہ وہ قریش مکہ کو بتائیں کہ مسلمان جنگ کرنے نہیں آئے۔ وہ تو محض عمرہ کرنے آئے ہیں۔

اس کے باوجود قریش مکہ مُصِر رہے کہ مسلمان مکہ میں نہیں آسکتے۔ فریقین میں مذاکرات ہوئے۔ آخر یہ طے ہوا کہ مسلمان مدینہ لوٹ جائیں اور اگلے برس عمرے کے لیے آئیں۔ صلح نامے کی بعض شرائط وقتی طور پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی سمجھ میں نہیں آئیں۔

انھوں نے سمجھا کہ مسلمانوں کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا: "ابو بکر! کیا یہ رسول اللہ نہیں؟"

بلاشبہ! رسول اللہ ہیں!" حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔

"یا پھر ہم مسلمان نہیں!"

"کیوں نہیں۔ ہم بھی مسلمان ہی ہیں۔"

"تو پھر یہ لوگ مشرکین نہیں؟"

"نہیں۔ یہ بھی مشرکین ہی ہیں۔" حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قدرے حیران ہو کر کہا۔

"تو پھر اپنے دین کے معاملے میں ہم سے گھٹیا شرائط کیوں منوائی جاتی ہیں؟"

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "عمر! انھی کے راستے پر چلتے رہو۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔" اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی کہا: "میں بھی شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔" [1]

یہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ایمان کامل ہی تھا جس نے اُن سے یہ جواب کہلایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اسی درجہ ایمانی پر فائز تھے، تاہم وہ پہلے پہل بات سمجھ نہیں پائے۔ اس سلسلے میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اُن پر سبقت حاصل تھی۔

ایک مرتبہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ لوگوں میں آپ کو سب سے پیارا کون ہے۔ فرمایا: "عائشہ"! عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا: "میرا مطلب تھا آدمیوں میں سے۔" فرمایا: "عائشہ کا والد۔ [1] "

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو جو فریضۂ رسالت سونپا تھا وہ آپ نے نہایت ذمہ داری سے سرانجام دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو مسلمان نہایت حیران ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک کہہ ڈالا":

کچھ منافق قسم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے ہیں۔ بخدا! رسول اللہ نے وفات نہیں پائی۔ وہ تو موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی طرح اپنے رب کے ہاں گئے ہیں۔ وہ ضرور واپس آئیں گے اور اُن لوگوں کے ہاتھ کاٹ ڈالیں گے جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے ہیں۔ کان کھول کر سن لو! میں نے جسے یہ کہتے سُن لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے ہیں، اپنی اِس تلوار سے اس کی گردن اڑادوں گا۔[2] ''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ باتیں کہہ رہے تھے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو چادر سے ڈھانپ کر گھر کے ایک گوشے میں رکھ دیا گیا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے چہرۂ اقدس پر سے چادر کا پلو ہٹایا، مبارک پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا'' :فداک أبي و أمي) !میرے ماں باپ آپ پر قربان) آپ زندہ و مردہ دونوں حالتوں میں پاکیزہ ہیں۔ اللہ نے آپ کے لیے جو موت لکھی تھی وہ آپ کو آگئی۔'' یہ کہہ کر چادر کا پلو دوبارہ چہرۂ اقدس پر ڈال دیا۔

کاشانۂ نبوی سے باہر آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی لہجے میں بول رہے تھے۔ انھیں

[1]صحيح البخاري، حديث: 3662- [2] البداية والنهاية لابن كثير:5/272-

خاموش ہونے کو کہا۔ وہ بولتے رہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ خاموش نہیں ہوتے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور گفتگو کا آغاز کر دیا۔ لوگ بھی خاموشی سے آپ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ آپ نے اللہ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا: ''لوگو! جو آدمی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا وہ سن لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے ہیں۔ اور جو آدمی اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ جان لے کہ اللہ زندۂ جاوید ہے۔ وہ کبھی وفات نہیں پائے گا۔''

پھر آپ نے یہ آیت قرآنی تلاوت فرمائی: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ﴾ ''محمد بھی تو رسول ہی ہیں۔ اُن سے پہلے بھی رسول گزرے۔ تو کیا اگر وہ وفات پا جائیں یا مقتول ہوں تو تم اپنی ایڑیوں پر مڑ جاؤ گے؟ اور جو اپنی ایڑیوں پر مڑے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہیں کرے گا۔ اور اللہ عنقریب شکر کرنے والوں کو جزا دے گا۔'' [1] لوگوں کی یہ حالت تھی کہ گویا پہلی مرتبہ یہ آیت سن رہے ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی گفتگو سن کر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ یقین ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعی وفات پا چکے ہیں تو وہ غش کھا کر گر پڑے۔[2]

[1]آل عمران 144:3، صحيح البخاري، حديث: 3668- [2] البداية والنهاية لابن كثير:5/272-

حیات نبوی میں نماز کی امامت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار پڑے تو بلال رضی اللہ عنہ آپ کو نماز کی اطلاع دینے آئے۔ آپ نے فرمایا: ''ابو بکر سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھادیں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! ابو بکر زود رنج آدمی ہیں۔ آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو مارے غم اور رقت کے تلاوت نہیں کر پائیں گے۔ اگر آپ عمر سے نماز پڑھانے کو کہہ دیں تو بہتر ہو۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابو بکر ہی سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔''

میں نے حفصہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تم کہو۔ حفصہ رضی اللہ عنہا بھی حاضر خدمت ہوئیں اور وہی بات کہی جو میں نے کہی تھی۔

آپ نے ڈانٹ دیا: ''بلاشبہ تم تو یوسف والیاں ہو۔ ابو بکر ہی سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔'' حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ناراض ہو کر کہا: ''تم سے تو مجھے کبھی بھلائی نہ ملی۔'' [1]

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نماز کا آغاز کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قدرے افاقہ معلوم ہوا۔ آپ دو آدمیوں کے سہارے مسجد میں تشریف لائے۔ کمزوری کے مارے پاؤں لٹکے ہوئے تھے اور زمین پر لکیریں کھنچتی آتی تھیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ کی آہٹ پائی تو پیچھے ہٹنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا کہ کھڑے رہیے۔ آپ آگے تشریف لائے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بائیں طرف بیٹھ گئے۔ یوں آپ لوگوں کو بیٹھ کر نماز پڑھاتے رہے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے رہے۔ حضرت

[1]صحيح البخاري، حديث: 678-683،682۔

ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرتے اور لوگ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اقتدا کرتے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی کا امامت کے لیے کیوں انتخاب کیا گیا۔ کیا اس لیے کہ وہ آدمیوں میں سب سے پہلے ایمان لائے تھے یا اس لیے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یارِ غار تھے یا پھر اس لیے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی اور آپ کے پیارے تھے؟ ممکن ہے کہ یہ تینوں اسباب بھی ہوں، تاہم بنیادی اسباب یہ نہیں تھے۔

دراصل وفات نبوی کے بعد امت کو جس مشکل مرحلے سے گزرنا اور جس گھمبیر مسئلے کا شکار ہونا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ آپ بلاشبہ بڑے مردم شناس تھے۔ آپ نے نگاہِ بصیرت سے دیکھ لیا تھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی اس اہم ذمے داری کو پورا کر سکتے ہیں۔ اس کی تائید حضرت مطعم بن عدی رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ ایک خاتون کسی

سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آئی۔ آپ نے اُس سے فرمایا: "دوبارہ آنا۔" اس نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ سے ملاقات نہ ہوسکے تو (مطلب یہ کہ آپ وفات پا جائیں تو) کس سے ملاقات کروں۔ فرمایا: "تو ابو بکر سے ملنا۔" [1]

معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امور ریاست کی ذمے داری سونپا کرتے اور انھیں اس کا اہل سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کی کثیر تعداد کو بھی اُن کے اِس مقام و مرتبے کا احساس تھا۔ تو سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اِس امر کے متعلق کیوں فکر مند تھیں۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ کیوں عرض کیا اور بعد میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے بھی کہلوایا کہ ابو بکر

(رضی اللہ عنہ) زود رنج آدمی ہیں۔ وہ آپ

[1]الطبقات الکبرٰی لابن سعد:3/178، ومسند أحمد، حدیث: 16813۔

کی جگہ کھڑے ہوں گے تو تلاوت نہیں کر پائیں گے۔ آخر اس کی وجہ کیا تھی۔

اس کی وجہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خود بیان فرمائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میرا خیال یہ تھا، جو آدمی وفات نبوی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مصلے پر کھڑا ہو گا اور آپ کا نائب بنے گا، لوگ اُسے کبھی پسند نہیں کریں گے۔ لوگ اُسے بدفالی کی علامت بنا ڈالیں گے۔ اسی خدشے کے پیش نظر میں یہ چاہتی تھی کہ میرے والد لوگوں کی نفرت کا نشانہ نہ بنیں۔[1]

[1]صحیح مسلم، حدیث: 418۔

بیعتِ خلافت

انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں اکٹھے ہوئے۔ مہاجرین کو پتہ چلا تو وہ بھی پہنچ گئے۔ ایک انصاری صحابی حضرت خباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے مہاجرین سے کہا کہ ایک امیر ہم میں سے ہو گا اور ایک آپ میں سے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ عرب، قریش کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم نہیں کریں گے۔ ہم امیر ہوں گے اور آپ وزیر۔ آپ کی مشاورت کے بغیر کوئی معاملہ طے نہیں پائے گا۔ عمر بن خطاب اور ابو عبیدہ میں سے کسی ایک کی بیعت کر لیجیے۔

اِس پر حضرت عمر اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ اس کے ساتھ ہی تمام مہاجرین و انصار بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اگلے روز حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں خلیفہ کی حیثیت سے تقریر کی اور منشورِ خلافت پیش کیا۔ حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا:

"لوگو! مجھے تمھارا والی بنا دیا گیا ہے حالانکہ میں تم میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ قرآن نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی سنتیں اختیار کیں۔ اور ہم نے قرآن و سنت کا بہت سا علم حاصل کیا۔ یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ نہایت سمجھ داری کی بات تقویٰ ہے جبکہ نہایت احمقانہ بات فسق و فجور ہے۔

یاد رکھو کہ تم میں سے سب سے طاقتور آدمی میرے حساب سے کمزور ہے تا آنکہ میں اس سے وہ معاملہ کروں جس کا وہ مستحق ہے۔ اور تم میں سے کمزور ترین آدمی میرے حساب سے قوی ہے تا آنکہ میں اُس کا بھی حساب برابر کر دوں۔ لوگو! میں تو بس پیروکار ہوں (دین کے معاملے میں) کوئی نیا کام میں نہیں کروں گا۔ میں اگر اچھا کروں تو میری مدد کرنا۔ ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کر دینا۔" [1]

اسلام میں جو آدمی لوگوں کا حاکم بنتا ہے وہ انھی کا ایک عام فرد ہوتا ہے۔ اسے حکمرانی کی ذمے داریاں سونپی جاتی ہیں۔ ایک عام فرد کی طرح وہ لوگوں پر اپنی رائے نہیں ٹھونس سکتا نہ اُن سے مشاورت کیے بنا کوئی فیصلہ کر سکتا ہے۔ ریاست کے عام افراد کی طرح اگر وہ اچھے کام کرتا ہے تو اُس کی عزت بڑھتی ہے اور مقام و مرتبہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور لوگوں کے دل میں اُس کی محبت جاگزیں ہوتی ہے۔ اسی امر کا اعادہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی صدارتی تقریر میں کیا تھا۔ انھوں نے واضح کیا تھا کہ اُن کا طرز حکومت جن اصولوں پر مبنی ہو گا وہ براہِ راست قرآن و سنت سے ماخوذ ہوں گے۔ وہ ہر حال میں اسلامی تعلیمات کی پیروی کریں گے اور اسی کو اپنا شعار بنائیں گے۔ یوں نہ تو کوئی طاقتور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی خلاف ورزی کر پائے گا نہ کسی کمزور کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا جا سکے گا۔ شریعت کی نظر میں سب کے سب برابر ہیں -نہ کوئی ادنیٰ ہے نہ کوئی اعلیٰ- کیونکہ سب آدم کے بیٹے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔

خدمتِ خلق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فطرت کا حصہ تھی۔ اکثر اوقات مدینہ کی بڑی بوڑھی خواتین کی بکریوں کا دودھ دوہ دیتے۔ انھیں آٹا گوندھ دیتے۔ گھر کی صفائی

[1]الطبقات الکبرٰی لابن سعد:3،182-183، الکامل لابن الأثیر: 2،332۔

ستھرائی کر دیتے۔ خلیفہ بنے تو ایک روز ایک بچی اپنی والدہ سے کہنے لگی: "اماں! اب بکریوں کا دودھ کون دوہا کرے گا؟" کسی نے جا کر اُس بچی کی بات حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بتا دی۔ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمایا: "مجھے میری زندگی کی قسم! میں اب بھی اُن کی بکریوں کا دودھ دوہا کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ جو ذمے داری مجھ پر پڑی ہے اس کے باعث میرے معمولات نہیں بدلیں گے۔ [1] "

یوں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے منصبِ خلافت پر فائز ہونے کے بعد بھی خدمت خلق کا کام جاری رکھا۔ ایک مرتبہ ایک بکری کا دودھ دوہنے لگے تو ایک نو عمر لڑکی جو پاس ہی کھڑی تھی، آپ رضی اللہ عنہ مزاحیہ انداز میں اُس سے کہنے لگے: "اے لڑکی! بولو، جھاگ بناؤں کہ نہیں"! وہ لڑکی بولی: "جھاگ بناؤ۔" تو وہ دودھ دوہتے ہوئے جھاگ بنانے لگے۔ کبھی وہ لڑکی کہتی کہ جھاگ مت بنانا تو وہ جھاگ نہ بناتے۔ [2]

[1]الطبقات الکبرٰی لابن سعد:3،186۔ [2] کنز العمال: 5،610۔

جمع صدیقی... اسباب و منہج

اسباب:

اہل علم نے خلیفۂ اوّل سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جمع قرآن کے متعدد اسباب ذکر کیے ہیں۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا اور منصب خلافت کی ذمہ داری سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر آن پڑھی تو بعض عرب قبائل مختلف اسباب کی بنیاد پر اسلام سے مرتد ہو گئے اور انہوں نے زکوٰۃ جیسے بعض اسلامی حقوق کا انکار کر دیا اور بعض قبائل مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کے ساتھ جا ملے۔ چنانچہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان مرتدین اور مانعین زکوۃ کے خلاف جہاد کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں پورا جزیرۃ العرب اسلام کے سائے تلے آ گیا۔

ان فتنوں کی سرکوبی کے لیے لشکر اسلامی میں قرآن مجید کے حفاظ کی بہت بڑی تعداد نے شرکت فرمائی اور مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑی جانے والی اس لڑائی معرکۂ یمامہ میں متعدد حفاظ کرام مرتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

جب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس معرکہ اور دیگر معارک میں ہونے والی کثیر تعداد میں حفاظ کرام کی شہادتوں کو دیکھا تو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن کا مشورہ دیا۔ تاکہ ان حفاظ کرام کی شہادتوں سے قرآن ضائع نہ ہو جائے۔

امام بخاری رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ سیّدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (ت ۴۵ھ) سے روایت

کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

((أَرْسَلَ اِلَيَّ اَبُوبَكْرٍ الصِّدِّيق مَقْتَلَ أَهْلِ الْيَمَامَةِ، فَإِذَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ عِنْدَهُ، قَالَ اَبُوبَكْرٍ رضی اللہ عنه : إِنَّ عُمَرَ أَتَانِيْ فَقَالَ: اِنَّ الْقَتْلَ قَدِ اسْتَحَرَّ يَوْمَ الْيَمَامَةِ بِقُرَّآءِ الْقُرْآنِ، وَإِنِّيْ أَخْشٰى أَنْ يَسْتَحِرَّ الْقَتْلُ بِالْقُرَّاءِ بِالْمَوَاطِنِ فَيَذْهَبَ كَثِيرٌ مِنَ الْقُرْآنِ وَإِنِّي أَرَى أَنْ تَأْمُرَ بِجَمْعِ الْقُرْآنِ قُلْتُ لِعُمَرَ كَيْفَ تَفْعَلُ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ علیه وسلم ؟ قَالَ عُمَرُ: هٰذَا وَاللّٰهِ خَيْرٌ، فَلَمْ يَزَلْ عُمَرُ يُرَاجِعُنِي حَتَّى شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِي لِذٰلِكَ وَرَأَيْتُ فِي ذٰلِكَ الَّذِي رَأَى عُمَرُ قَالَ زَيْدٌ قَالَ أَبُو بَكْرٍ إِنَّكَ رَجُلٌ شَابٌّ عَاقِلٌ لَا نَتَّهِمُكَ وَقَدْ كُنْتَ تَكْتُبُ الْوَحْيَ لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ علیه وسلم فَتَتَبَّعِ الْقُرْآنَ فَاجْمَعْهُ فَوَاللّٰهِ لَوْ كَلَّفُونِي نَقْلَ جَبَلٍ مِنَ الْجِبَالِ مَا كَانَ أَثْقَلَ عَلَيَّ مِمَّا أَمَرَنِي بِهِ مِنْ جَمْعِ الْقُرْآنِ قُلْتُ كَيْفَ تَفْعَلُونَ شَيْئًا لَمْ يَفْعَلْهُ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ علیه وسلم قَالَ هُوَ وَاللّٰهِ خَيْرٌ فَلَمْ يَزَلْ أَبُو بَكْرٍ يُرَاجِعُنِي حَتَّى شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرِي لِلَّذِي شَرَحَ لَهُ صَدْرَ أَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا فَتَتَبَّعْتُ الْقُرْآنَ أَجْمَعُهُ مِنَ الْعُسُبِ وَاللِّخَافِ وَصُدُورِ الرِّجَالِ حَتَّى وَجَدْتُ آخِرَ سُورَةِ التَّوْبَةِ مَعَ أَبِي خُزَيْمَةَ الْأَنْصَارِيِّ لَمْ أَجِدْهَا مَعَ أَحَدٍ غَيْرِهِ ﴿لَقَدْ جَاءَ

كُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ حَتَّى خَاتِمَةِ بَرَاءَةَ فَكَانَتِ الصُّحُفُ عِنْدَ أَبِي بَكْرٍ حَتَّى تَوَفَّاهُ اللّٰهُ ثُمَّ عِنْدَ عُمَرَ حَيَاتَهُ ثُمَّ عِنْدَ حَفْصَةَ بِنْتِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ۔))[1]

''سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جنگ یمامہ کے موقع پر مجھے بلا بھیجا، اور آپ کے پاس سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی تشریف فرما تھے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے پاس سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور فرمایا: جنگ یمامہ کے دن بہت زیادہ قراء کرام نے جام شہادت نوش فرمایا ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ، اگر اسی طرح قراء کرام کی شہادتوں کا سلسلہ جاری رہا تو، کہیں قرآن مجید کا کچھ حصہ ضائع نہ ہو جائے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ کسی کو حکم دے کر قرآن مجید کو ایک جگہ جمع کروالیں۔ میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ کیسے وہ کام کر سکتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو؟! سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! یہ خیر ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اس پر مسلسل اصرار کرتے رہے، حتی کہ اللہ تعالی نے اس کام کے لیے میرا سینہ کھول دیا اور اب میری بھی وہی رائے ہے جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی تھی۔ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ ایک عقل مند نوجوان آدمی ہیں، ہمیں آپ پر کوئی اشکال بھی نہیں ہے نیز آپ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وحی لکھا کرتے تھے۔ لہٰذا آپ قرآن مجید کو متفرق جگہوں سے تلاش کر کے ایک جگہ جمع فرمادیں۔

اللہ کی قسم! اگر وہ مجھے پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ کو اٹھانے کا حکم دیتے تو جمع قرآن کے اس عظیم کام سے زیادہ مجھ پر بھاری نہ ہوتا۔ میں نے کہا: آپفاروق رضی اللہ عنہما کا کھولا تھا۔ چنانچہ میں نے قرآن مجید کو کھجور کی شاخوں، ہڈیوں، چمڑے کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے تلاش کر کے ایک جگہ جمع کر دیا۔ حتی کہ سورۃ توبہ کی آخری دو آیات ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ .... ﴾ سے لے کر آخر سورۃ تک مجھے سیدنا ابو خزیمہ انصاری کے علاوہ کسی کے پاس نہ ملیں۔

جب پورا قرآن مجید ایک جگہ جمع ہو گیا تو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس محفوظ کر لیا، جو آپ کی وفات تک آپ کے پاس رہا، آپ کی وفات کے بعد سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس منتقل ہو گیا اور ان کی زندگی میں ان کے پاس موجود رہا، پھر آپ کی شہادت کے بعد آپ کی بیٹی ام المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس محفوظ رہا۔''

اسلوب و منہج:

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ مکمل قرآن مجید کے حافظ تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے قرآن مجید کی حفاظت اور مقام و مرتبے کے شایان شان ایک منہج مقرر کیا اور اس کے مطابق پورے قرآن مجید کو جمع کیا۔ تاکہ کوئی غیر قرآن شے یا چیز، قرآن کا حصہ نہ بن جائے اور قرآن مجید کا کوئی حرف یا کلمہ ناقص نہ رہ جائے۔ آپ اس وقت تک کوئی آیت مبارکہ نہیں لکھتے تھے جب تک دو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ گواہی

نہ دیتے تھے کہ یہ آیت مبارکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئی ہے، اور ان وجوہ کے مطابق ہے، جن پر قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ صرف حفظ پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ نیز اس بات کا بھی لحاظ رکھتے تھے کہ وہ آیت مبارکہ منسوخ نہیں ہوئی اور عرصۂ اَخیرہ میں ثابت تھی۔[1]

اعتراض:

اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے سورۃ توبہ کی آخری دو آیات کی کتابت میں اس قاعدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں آیات انہوں نے فقط ایک صحابی ابو خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس پائی تھیں۔ اس میں دو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گواہی نہیں لی گئی۔

جواب:

دراصل بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں آیات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے میں خود سیدنا

کیسے وہ کام کرسکتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! یہ خیر ہے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلسل اصرار کرتے رہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے میرا سینہ بھی کھول دیا، جس کے لیے سیدنا ابو بکر اور سیدنا عمر زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے۔ لہٰذا یہاں بھی قاعدے کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔[1]

امام ابن ابی داؤد رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ سیدنا عبد اللہ بن زبیر سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

((أَتَى الْحَارِثُ ابْنُ خُزَيْمَةَ بِهَا تَيْنِ الْآيَتَيْنِ مِنْ آخِرِ سُوْرَةِ بَرَآئَةَ فَقَالَ: أَشْهَدُ أَنِّيْ سَمِعْتُهُمَا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَوَعَيْتُهُمَا، فَقَالَ عُمَرُ: وَأَنَا أَشْهَدُ لَقَدْ سَمِعْتُهُمَا۔)) [2]

"سیدنا حارث بن خزیمہ رضی اللہ عنہ سورۃ توبہ کی ان دونوں آخری آیات کو لے کر آئے اور گواہی دی کہ میں نے ان دونوں آیات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اور محفوظ کیا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں بھی گواہی دیتا کہ میں نے بھی ان دونوں آیات کو سنا ہے۔"

اس عظیم الشان مہم کی ادائیگی پر سیدنا زید بن ثابت کو اس لیے منتخب کیا گیا، کیونکہ آپ ایک عقل مند، نوجوان اور تہمت سے پاک شخص تھے، نیز آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب وحی بھی رہے جیسا کہ صحیح بخاری کی سابقہ روایت میں گذرا ہے کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

((اِنَّکَ رَجُلٌ شَآبٌّ عَاقِلٌ، لَانَتَّهِمُکَ، وَقَدْ کُنْتَ تَکْتُبُ الْوَحْیَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ))

''آپ ایک نوجوان عقل مند آدمی ہیں۔ ہم آپ پر کوئی تہمت نہیں لگاتے، نیز آپ رسول اللہ کے لیے وحی لکھا کرتے تھے۔'' مذکورہ صفات جمیلہ آپ کی اس عظیم الشان خدمت کی ادائیگی کا سبب نہیں۔ جوان آدمی کام کرنے کی زیادہ قدرت رکھتا ہے اور یہ ایک نہایت مشکل کام تھا۔ عقل مند آدمی معلومات کو بہتر طریقے سے محفوظ کر سکتا ہے، تہمت سے پاک ہونے کی وجہ سے دل ان سے مطمئن ہو جاتا ہے اور کاتب وحی ہونے کی وجہ سے وہ جلدی سے لکھ سکتے تھے اور یہی وہ صفات ہیں جن کی بنیاد پر سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں نسخ مصاحف کی کمیٹی کا آپ کو نگران اور سربراہ مقرر کیا گیا۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔[1]

اس جلیل القدر خدمت کی ادائیگی پر تقریباً ایک سال کا عرصہ صرف ہوا، کیونکہ جنگ یمامہ گیارہ ہجری کے آخری یا بارہ ہجری کے ابتدائی مہینوں میں واقع ہوئی اور سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جمادی الاوّل تیرہ ہجری میں وفات پائی اور جمع قرآن کا کام آپ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل مکمل ہو گیا تھا۔ جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جن صحف میں قرآن مجید کو جمع فرمایا تھا وہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیئے جو ان کی زندگی میں ان کے پاس رہے، پھر ان کی وفات کے بعد سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس چلے گئے، پھر ان کی شہادت کے بعد سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہے، حتی کہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے انہیں منگوا کر ان سے متعدد مصاحف تیار کروائے۔[2] فوائد:...مذکورہ بالا کلام سے درج ذیل فوائد مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ عہد صدیقی میں جمع قرآن کا سبب، مختلف جنگوں میں قراء کرام کی کثیر شہادتوں کی وجہ سے ضیاع قرآن کا اندیشہ تھا۔ خصوصاً جنگ یمامہ میں بہت زیادہ قراء کرام نے جام شہادت نوش فرمایا۔

۲۔ یہ فقط نقل اور جمع تھی، چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں قرآن مجید متفرق جگہوں یعنی چمڑے، پتھر کی تختیوں اور جانوروں کی ہڈیوں وغیرہ پر لکھا ہوا موجود تھا اور ایک جگہ جمع نہیں تھا۔ چنانچہ عہد صدیقی میں اسے سورتوں اور آیات کی ترتیب لگا کر ایک جگہ جمع کر دیا گیا اور اس کا نام ((الصحف)) رکھا گیا۔ امام ابو عبد اللہ المحاسبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کتابت قرآن بدعت نہیں ہے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کو ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل کرنے کا حکم دیا اور یہ ان اوراق کی مانند ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بکھرے پڑے ہوں اور کوئی شخص انہیں جمع کر کے دھاگے کے ساتھ سلائی کر دے۔ تاکہ ان میں سے کوئی شے ضائع نہ ہو۔''[1]

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بعض ایسے مصاحف سامنے آئے، جو بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی ذاتی تلاوت کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر یا کاتبین وحی کی کتابت کو دیکھ کر لکھے تھے۔ جیسے مصحف عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور مصحف ابی بن کعب رضی اللہ عنہ وغیرہ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان ذاتی مصاحف میں بعض آیات کی تفاسیر اور بعض شاذ قراءات بھی لکھی ہوئی تھیں۔ لہٰذا سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے سرکاری مصاحف کی مختلف شہروں کی طرف روانگی کے بعد دیگر تمام مصاحف کو جلا دینے کا حکم دے دیا۔[2]

رسم عثمانی کی توقیفیت

رسم عثمانی کے مسئلہ پر اہل علم کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے توقیفا ثابت ہے، کیونکہ آپ نے ہی اس کا حکم دیا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو لکھا تھا۔

جبکہ بعض کے نزدیک یہ ایک اصطلاحی واجتہادی امر ہے، اور اس کی مخالفت کرنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے، عامۃ المسلمین کی مصلحت کی خاطر اسے جدید قواعد کے مطابق بھی لکھا جاسکتا ہے۔ اس مسئلہ میں اہل علم کے تین مذاہب ہیں:

(0) **پہلا مذہب:**... رسم مصحف توقیفی ہے، اس کو بدلنا ناجائز ہے اور اس کی مخالفت حرام ہے۔ اس کا حکم قرآن مجید کی سورتوں اور آیات کی ترتیب کے حکم کی مانند ہے، جس طرح سورتوں اور آیات کو مقدم ومؤخر کرنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے، اسی طرح رسم مصحف کو بدلنا بھی جائز نہیں ہے۔

یہ امت کے جمہور سلف وخلف کا مذہب ہے اور متعدد اہل علم نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔

دوسرا مذہب:... رسم مصحف توقیفی نہیں ہے، اس کو حسب ضرورت جدید قواعد کے مطابق بدلنا جائز ہے۔ اس مذہب کی تائید امام ابو بکر الباقلانی رحمہ اللہ، علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ اور متعدد معاصر اہل علم نے کی ہے۔[1]

(0) **تیسرا مذہب:**... عامۃ الناس کے لیے جدید قواعد کے مطابق لکھ دیا جائے، جبکہ علماء اور مخصوص لوگوں کے لیے رسم عثمانی کے مطابق کتابت کی جائے اور اس کو نفیس آثار کے حکم میں رکھا جائے۔ اس مذہب کی تائید شیخ عزالدین رحمہ اللہ بن عبد السلام اور امام بدر الدین الزرکشی رحمہ اللہ نے فرمائی ہے۔[1]

مذکورہ مذاہب ثلاثہ کے دلائل پہلے مذہب کے دلائل:

(1) جمہور اہل علم نے اپنے مذہب، کہ رسم عثمانی توقیفی ہے اور اس میں تبدیلی ناجائز ہے، کی صحت پر درج ذیل دلائل سے استدلال کیا ہے۔ ا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دو جہتوں سے نص قرآنی کی توثیق پر بہت زیادہ حریص تھے۔

پہلی جہت: حفظ:

(2) آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعے نازل ہونے والا مکمل قرآن مجید سب سے پہلے خود حفظ کر لیتے تھے، پھر اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پڑھاتے تھے، جو اسے حفظ کر لیتے تھے۔ آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حفظ قرآن کا حکم بھی دیتے تھے۔

دوسری جہت: کتابت:

جیسا کہ پہلے بھی گذر چکا ہے کہ آپ نے چند کاتبین وحی مقرر کر رکھے تھے، جو آپ کے لیے وحی لکھا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی لکھوانے کے بعد اس کی مراجعت فرماتے اور غلطیوں کی اصلاح فرمادیتے تھے۔ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((كُنْتُ أَكْتُبُ الْوَحْيَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَهُوَ يُمْلِيْ عَلَيّ. فَإِذَا فَرَغْتُ قَالَ ﴿اِقْرَأْ﴾ فَأَقْرَءُهُ. فَإِذَا كَانَ فِيْهِ سَقْطٌ أَقَامَهُ. ثُمَّ أَخْرُجُ بِهِ إِلَى النَّاسِ)) [2] "میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی لکھا کرتا تھا، اور آپ مجھے املاء کروایا کرتے تھے، جب میں لکھ کر فارغ ہو جاتا تو آپ فرماتے: پڑھو۔ میں اس کو پڑھتا، اگر اس میں کوئی نقص ہوتا تو آپ اصلاح فرمادیتے، پھر میں اسے لے کر لوگوں کی طرف نکلتا۔"

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بسا اوقات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کئی کئی سورتیں نازل ہو جاتیں، اور آپ کا طریقہ کار یہ تھا کہ جب بھی کوئی وحی نازل ہوتی تو آپ کاتبین وحی کو بلا کر فرماتے:

((ضَعُوْا هٰذِهِ الْآيَاتِ فِي السُّوْرَةِ الَّتِيْ يُذْكَرُ فِيْهَا كَذَا وَكَذَا. وَإِذَا أُنْزِلَتْ عَلَيْهِ الْآيَةُ يَقُوْلُ: ضَعُوْا هٰذِهِ الْآيَةَ فِي السُّوْرَةِ الَّتِيْ يُذْكَرُ فِيْهَا كَذَا وَكَذَا)) [1] "

ان آیات کو اس سورۃ میں رکھو جس میں یوں یوں تذکرہ ہے، اور جب کوئی ایک آیت نازل ہوتی تو فرماتے: اس آیت کو اس سورۃ میں رکھو، جس میں یوں اور یوں ذکر کیا گیا ہے۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں مکمل قرآن مجید متفرق طور پر اس صورت پر لکھا جا چکا تھا، اگرچہ ایک جگہ جمع نہیں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کاتبین وحی کی راہنمائی بھی فرمایا کرتے تھے، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی راہنمائی کرتے ہوئے فرمایا:

((أَلْقِ الدَّوَاةَ، وَحَرِّفِ الْقَلَمَ، وَأَقِمِ الْبَآءَ، وَفَرِّقِ السِّيْنَ، وَلَا تُعَوِّرِ الْمِيْم، وَحَسِّنِ اللّٰهَ، وَمَدَّ الرَّحْمٰنَ، وَجَوِّدِ الرَّحِيْمَ))
"دوات کا منہ کھلا رکھو، قلم کو ترچھا پکڑو، باء کو کھڑا کرو، سین کے دندانوں میں فرق ڈالو، میم کو ٹیڑھا نہ کرو، لفظ اللہ کو خوبصورت بناؤ، لفظ الرحمن کو لمبا کرو اور لفظ الرحیم کو خوبصورت لکھو۔"

قاضی عیاض رحمہ اللہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

((وَهٰذَا وَإِنْ لَّمْ تَصِحّ الرِّوَايَةُ أَنَّهُ كَتَبَ. فَلَا يَبْعُدُ أَنْ يُرْزَقَ عِلْمُ هٰذَا وَيُمْنَعَ الْقِرَآءَةُ وَالْكِتَابَةُ)) [1] "

اگرچہ آپ کے لکھنے کی یہ روایت صحیح نہیں ہے، لیکن یہ بھی کوئی بعید نہیں ہے کہ آپ کو اس کا علم عطا کر دیا گیا ہو، اور قراءۃ و کتابت سے منع کر دیا گیا ہو۔"

شیخ محمد حسنین مخلف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "

یہ روایت اس قول کے منافی نہیں ہے کہ آپ امی تھے اور آپ نے کتابت نہیں سیکھی تھی، کیونکہ اس صورت پر املاء بالتلقین کروانے سے کتابت جاننا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ پہلی چیز (یعنی املاء) وحی اور محض حروف کتابت کی خبر دینا ہے، جبکہ دوسری چیز کسبی اور ہاتھ کا ہنر ہے، جیسا کہ ہم میں سے ہر شخص ابتداءً کتابت سیکھتا ہے، پھر پڑھنے اور لکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ آپ نے نہ تو کتابت سیکھی ہے اور نہ کتابت کی ہے، تاکہ آپ کے بارے میں یہ وہم نہ ہو کہ آپ نے خود قرآن مجید تصنیف کیا ہے۔ اس سے آپ کا معاملہ مشکوک ہو جاتا۔"

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا كُنْتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ﴾ (العنکبوت:۴۸)

"اس سے پہلے تو آپ کوئی کتاب پڑھتے نہ تھے، اور نہ کسی کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے کہ یہ باطل پرست لوگ شک و شبہ میں پڑتے۔"

کتابت آپ سے کسی صورت میں بھی واقع نہیں ہوئی، نہ وحی سے نہ تعلیم سے اور نہ ہی کسی دوسرے ذریعے سے، جیسے سلیقہ عربی سے شعر پیدا ہوتا ہے۔[2]

وہ چیز جس پر اہل علم کا کوئی اختلاف نہیں ہے، یہ ہے کہ قرآن مجید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے اسی کتابت کے مطابق ثابت رکھا۔ یہ گویا تقریری سنت ہے۔ اور تقریری سنت تمام محدثین و اُصولین کے نزدیک قابل حجت ہے۔ اگر کتابت میں کوئی خطا ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس پر ثابت نہ رکھتے۔ کیونکہ کتابت کی غلطی وعدہ حفاظت الٰہی: ﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ﴾ کے صریح مخالف ہے۔

صاحب کتاب الابریز اپنے شیخ عبد العزیز الدباغ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"رسم قرآن، مشاہدہ اور کمال رفعت کے اسرار و رموز میں سے ایک راز ہے۔ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوا ہے۔ رسم قرآن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا دیگر اہل علم کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توقیفاً ثابت ہے۔ آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نقص و زیادت کی اس معروف ہیئت پر لکھنے کا حکم دیا تھا۔ اس معروف ہیئت میں متعدد اسرار و رموز پوشیدہ ہیں، جن تک نصرت الٰہی کے بغیر عقول نہیں پہنچ

سکتیں۔ اللہ تعالیٰ نے دیگر کتب سماویہ کو چھوڑ کر قرآن مجید کو ان اسرار کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔ جس طرح قرآن مجید کا نظم معجزہ ہے، اسی طرح اس کا رسم بھی معجزہ ہے۔" [1]

۲۔ فعل صحابہ: رسم عثمانی کے توقیفی ہونے پر دوسری دلیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فعل ہے۔ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ جب سیدنا اَبو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر متمکن ہوئے اور انہوں نے جمع قرآن کا حکم دیا، تو انہوں نے قرآن مجید کو اس ہیئت کتابت پر لکھوایا، جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔ پھر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں لکھے گئے صحف سے مصاحف تیار کروائے۔ اور ان مصاحف کا رسم صحف صدیقی کے موافق تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفاء راشدین کی اقتداء اور ان کے فعل کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے۔

((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ مِنْ بَعْدِيْ)) [1]

"میرے بعد تم میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔" امام احمد سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ مُتَأَسِّيًا فَلْيَتَأَسَّ بِأَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ، فَإِنَّهُمْ كَانُوْا أَبَرَّ هٰذِهِ الْأُمَّةِ قُلُوْبًا، وَأَعْمَقُهَا عِلْمًا، وَأَقَلُّهَا تَكَلُّفًا، وَأَقْوَمُهَا هَدْيًا، وَأَحْسَنُهَا حَالًا، قُوْمٌ اخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ، وَإِقَامَةِ دِيْنِهٖ، فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ، وَاتَّبِعُوْا آثَارَهُمْ، فَإِنَّهُمْ كَانُوْا عَلَى الْهَدْيِ الْمُسْتَقِيْمِ)) [2]

"جو شخص کسی کی اقتداء کرنا چاہتا ہو، اسے چاہیے کہ وہ اَصحاب رسول کی اقتداء کرے، بیشک وہ اس امت کے سب سے نیک دل، عمیق العلم، قلیل التکلف، ہدایت یافتہ، اور خوبصورت ایمان والے لوگ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور اپنے دین کی خدمت کے لیے منتخب فرمایا، ان کے علم و فضل کو پہچانو اور ان کے نقش قدم پر چلو، بے شک وہ لوگ صراط مستقیم پر قائم تھے۔"

۳۔ اجماع:

یہ بات واضح ہے کہ قرآن مجید سیدنا اَبو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جمع کیا گیا، اور لکھا گیا اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جمع کردہ صحف سے مصاحف نقل کروائے اور مختلف بلاد اسلامیہ کی طرف روانہ کیے۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، جن کی تعداد بارہ ہزار تھی، نے اس عمل کو شرف قبولیت سے نوازا اور کسی ایک صحابی نے بھی اس کی مخالفت نہ کی۔

یہ گویا کہ اس عمل کی صحت پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع تھا، چنانچہ اس کی مخالفت ناجائز اور حرام ہے پھر تابعین، ائمہ مجتہدین اور تمام زمانوں کے ائمہ قراءت نے اس کی اقتداء کی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ کیا مصاحف کو جدید قواعد املائیہ کے مطابق لکھنا جائز ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:

((لَا أَرٰی ذٰلِکَ، وَلٰکِنْ یُکْتَبُ عَلَی الْکَتْبَۃِ الْأُوْلٰی)) [1]

''میں اسے جائز نہیں سمجھتا، اس کو پہلی کتابت (یعنی رسم عثمانی) پر ہی لکھا جانا چاہیے۔'' امام دانی رحمہ اللہ، امام مالک رحمہ اللہ کا یہ فتویٰ نقل کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

((وَلَا مُخَالِفَ لَہٗ فِی ذٰلِکَ مِنْ عُلَمَآئِ الْأُمَّۃِ)) [2]

''علماء امت میں سے کوئی بھی امام مالک رحمہ اللہ کے اس موقف کا مخالف نہیں ہے۔'' امام أحمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

((تَحْرُمُ مُخَالَفَۃُ خَطِّ مُصْحَفِ عُثْمَانَ فِیْ وَاوٍ اَوْ أَلِفٍ أَوْ غَیْرِ ذٰلِکَ)) [3]

''ألف، واؤ اور یاء وغیرہ میں مصحف عثمان کے خط کی مخالفت کرنا حرام عمل ہے۔''

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تمام مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ روئے زمین کے تمام اطراف میں پڑھا جانے والا، اور مسلمانوں کے ہاتھوں دو گتوں کے درمیان لکھا جانے والا قرآن جو ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ سے شروع ہوتا ہے اور ﴿مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ﴾ پر ختم ہوتا ہے، یہ اللہ کا کلام اور اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی وحی الٰہی ہے، اس میں جو کچھ موجود ہے وہ سب برحق ہے۔ جس شخص نے جان بوجھ کر اس میں سے کوئی حرف کم کر دیا، یا ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف بدل دیا، یا مجمع علیہ مصحف پر کوئی حرف زیادہ کر دیا، تو وہ کافر ہے۔''[1]

امام جعبری رحمہ اللہ وغیرہ نے مصحف عثمانی کے رسم کی اتباع کے وجوب پر ائمہ أربعہ کا اجماع نقل کیا ہے۔[2]

شرح طحاوی میں مکتوب ہے کہ ''جو شخص قرآن مجید لکھنا چاہتا ہو، اسے چاہیے کہ وہ کلمات کو اس انداز سے منظم کرے جس طرح مصحف عثمان میں ہے، کیونکہ اس پر امت کا اجماع ہے۔''[3] امام زمخشری رحمہ اللہ آیت مبارکہ ﴿وَقَالُوا مَالِ هَذَا الرَّسُولِ﴾ (الفرقان:۷) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ، مصحف میں لام ﴿هَذَا﴾ سے کاٹ کر لکھا ہوا ہے، جو خط عربی کے قواعد سے خارج ہے، اور مصحف کا خط سنت ہے، جس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔'' شعب الایمان للبیہقی میں مرقوم ہے: ''جو شخص مصحف لکھے، اسے چاہیے کہ وہ ان حروف ھجاء کی حفاظت کرے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مصاحف عثمانیہ میں لکھے تھے اور ان کی مخالفت نہ کرے اور نہ ہی کسی شيء کو تبدیل کرے۔ بے شک وہ لوگ ہم سے زیادہ عالم، دل و زبان کے سچے اور امانت دار تھے۔ لہٰذا ہمیں ان کا استدراک کرنے کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔''[4]

۴۔ قواعد املائیہ محل تغییر ہیں، جو ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک جاتے ہوئے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اگر مصاحف کو رسم قیاسی اور جدید قواعد املائیہ کے مطابق لکھا جاتا تو تمام مصاحف ایک دوسرے سے مختلف ہوتے اور لوگ نفس مصحف میں اشکال کا شکار ہو جاتے۔ لہٰذا شامی شخص مصحف مصری سے، مغربی مصحف مشرقی سے تلاوت نہ کر سکتا، اور تقریباً وہی مشکلات پیدا ہو جاتیں جو سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئی تھیں۔ اگر مصحف کو رسم قیاسی کے مطابق لکھا جاتا تو دشمنان اسلام کی جانب سے قرآن مجید کے کلمات و حروف میں تحریف کا دروازہ کھل جاتا۔ سد ذریعہ تشریع اسلامی کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی حرمت کو پامال کرنے والے ہر دروازے کو بند کرنا فرض اور واجب ہے اور اس دروازے کی بندش رسم عثمانی کی بقاء میں ہے۔[1]

۵۔ تلاوت قرآن مجید کے کچھ مخصوص احکام ہیں، جنہیں تلقی و مشابہت کے بغیر جاننا ناممکن ہے۔ تلقی اور مشافہت کی یہ سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر قیامت تک متصل ہو گی۔ یہ امتیاز صرف قرآن مجید کو حاصل ہے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو مختص کیا ہے۔ رسم عثمانی کی بقاء مسلمان ماہرین سے تلقی و مشافہت کی حرص پیدا کرتی ہے اور سند کا سلسلہ متصل رہتا ہے۔[2]

٦۔ رسم عثمانی میں بعض ایسے خصائص اور امتیازات پائے جاتے ہیں، جو رسم قیاسی میں نہیں پائے جاتے، ان امتیازات میں سے چند اہم درج ذیل ہیں۔
ا۔ کلمہ میں وارد اَوجہ قراءات کی طرف اشارہ:

جیسا کہ پہلے بھی مصاحف کی کیفیت کے بیان میں گذر چکا ہے کہ وہ مصاحف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ثابت غیر منسوخ التلاوۃ حروف پر مشتمل تھے۔ اور قراءات صحیحہ کی شرائط میں سے ایک شرط رسم مصحف کی موافقت بھی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسم عثمانی کا قراءات قرآنیہ کے ساتھ بڑا مضبوط تعلق ہے، اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی دوسرا رسم اس کے قائم مقام بن سکے۔ مثال کے طور پر ھاء تانیث کو کبھی تاء کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور کبھی ھاء کے ساتھ۔ اور ھاء تانیث کا یہ رسم کسی حادثے کا نتیجہ نہیں بلکہ قراءات قرآنیہ کے تابع ہے۔

قرآن مجید میں لفظ ﴿بَيِّنَةٌ﴾ انیس (١٩) مقامات پر آیا ہے۔ اس کو تمام مقامات پر ھاء کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ صرف ایک جگہ تاء کے ساتھ مکتوب ہے۔ ﴿أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِّنْهُ﴾ (فاطر: ٤٠) اس کا سبب یہ ہے کہ اس ایک مقام پر قراء عشرہ کا اختلاف ہے۔ بعض قراء اسے ﴿بَيِّنَاتٍ﴾ جمع کے صیغے کے ساتھ، اور بعض قراء مفرد کے صیغے کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ چنانچہ اس کو تاء کے ساتھ لکھا گیا ہے تاکہ دونوں قراءات کا احتمال باقی رہے۔ جبکہ دیگر تمام مقامات پر تمام قراء کرام بالاتفاق مفرد کے صیغے میں پڑھتے ہیں، لہٰذا انہیں ھاء کے ساتھ لکھا گیا ہے۔[1]

۲۔ بعض عرب لغات پر دلالت: رسم عثمانی کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ اس سے بعض عرب لغات پر دلالت ہوتی ہے اور اہل عرب اس امر پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ قرآن مجید ان کی لغت میں نازل ہوا ہے اور انہی کی لغت میں لکھا گیا ہے۔

مثال کے طور پر بعض مقامات پر ھائے تانیث کو تائے مفتوحہ کے ساتھ لکھا گیا ہے، تاکہ لغت طی کے مطابق اس پر وقف بالتاء کیا جا سکے۔ جیسے:

﴿إِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيبٌ مِنَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (الاعراف:۵۶)، ﴿وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوهَا﴾ (ابراہیم: ۳۴)

اسی طرح بعض دفعہ بغیر جازم کے یاء مضارع کو حذف کر دیا جاتا ہے جیسے: ﴿يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾ (ہود:۱۰۵) یہ قبیلہ ھذیل کی لغت ہے۔ یہاں لفظ ﴿يَأْتِ﴾ کے آخر سے بغیر جازم کے یاء حذف کر دی گئی ہے۔[2]

۳۔ اتصال سند:

رسم عثمانی کے خصائص میں سے ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک اتصال سند کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ اگر قرآن مجید رسم قیاسی کے مطابق مکتوب ہوتا تو لوگ مشائخ سے تلقی و مشافہت کے طریقے سے مستغنی ہو جاتے اور مصاحف سے خود ہی قراءت پڑھنے پر اکتفاء کر لیتے۔ نتیجۃً مد، قصر، ادغام و اظہار، تحقیق و تسہیل، فتح و امالہ، تغلیظ و ترقیق، اور اشمام، روم وغیرہ جیسے متعدد طرق ادا کی معرفت سے محروم رہ جاتے۔ جن کا حصول تلقی و مشافہت کے بغیر ممکن نہیں ہے اور کوئی بھی شخص معلم سے سیکھے بغیر ﴿كهيعص﴾، ﴿حم، عسق﴾، ﴿طسم﴾، ﴿يس﴾ جیسے حروف مقطعات کا صحیح نطق نہ کر سکتا۔ اتصال سند کا یہ امتیاز صرف امت محمدیہ کو حاصل ہے، خصوصاً تلاوت قرآن مجید میں۔[1]

۴۔ اَصل حرکت پر دلالت: جیسا کہ پہلے بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مصاحف عثمانیہ نقط و حرکات سے خالی تھے۔ چنانچہ بعض حرکات پر دلالت کرنے کے لیے حروف کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔ جیسے:

﴿مِنْ نَبَإِ الْمُرْسَلِينَ﴾ (الانعام: ۳۴) میں ہمزہ کے بعد یاء کی زیادتی کسرہ پر دلالت کرتی ہے۔

﴿سَأُرِيكُمْ دَارَ الْفَاسِقِينَ﴾ (الاعراف:۱۴۵) میں واؤ کی زیادتی ہمزہ مضمومہ پر دلالت کرتی ہے۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ

﴿سَأُرِيكُمْ﴾ میں الف زائدہ ہے اور واؤ ہمزہ کی صورت ہے۔[2]

۵۔ اَصل حرف پر دلالت:

جیسے لفظ ﴿الصلاة، الزكاة، الحياة، الربا﴾ کو الف کی بجائے واؤ کے ساتھ لکھنا، یا الف کو یاء کے ساتھ لکھنا، اس امر پر دلالت کرنے کے لیے کہ اس کی اَصل یاء ہے اسمیں امالہ کرنے والے امالہ کرتے ہیں جیسے: ﴿والضحى، فهدى، التقوى، يغشى﴾ اور اگر اس کی اصل واؤ ہو تو اسے الف سے لکھا جاتا ہے تا کہ عدم امالہ پر دلالت کرے جیسے: ﴿الصفا، عفا، خلا، دعا، دنا﴾

۶۔ بعض دقیق معانی پر دلالت: رسم عثمانی کے امتیازات میں سے ایک امتیاز ایسے خفی اور دقیق معانی پر دلالت کرنا ہے، جو انتہائی غور و خوض یا نصرت الٰہی کے بغیر سمجھ نہیں آتے۔ دقیق معانی پر دلالت کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

اَهْلُ الْقُرْآنِ و رِجَالُ الْقُرْآنِ

(أ) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْيدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ ﴾ (الذاریات:۴۷)

اس آیت مبارکہ میں لفظ ﴿ بِأَيْيدٍ ﴾ کو دو یاؤں کے ساتھ لکھا گیا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق سموت کی عظیم قدرت پر اشارہ ہو سکے۔ اس قوت کے مشابہ کوئی قوت نہیں ہے۔ یہاں اس مشہور قاعدہ پر عمل کیا گیا ہے کہ ((زیادۃ المبنی تدل علی زیادۃ المعنی)) کلمہ کی بناء کی زیادتی، معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔

(ب) ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَجِايءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ ﴾ (الزمر:۶۹) اور ﴿ وَجِايءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ﴾ (الفجر:۲۳) ان دونوں مقامات پر لفظ ﴿ وَجِايءَ ﴾ کو زیادتی الف کے ساتھ لکھا گیا ہے تاکہ تفخیم، تہویل، وعید اور تہدید پر دلالت کرے۔

(ج) ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ بِأَيِّيكُمُ الْمَفْتُونُ ﴾ (القلم:۶) اس آیت مبارکہ میں لفظ ﴿ بِأَيِّيكُمُ ﴾ کو زیادتی یاء کے ساتھ لکھا گیا ہے تاکہ اس امر پر اشارہ کرے کہ مشرکین کا جنون انتہائی درجہ اور حدود کو تجاوز کیے ہوئے تھا۔ (د) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ تَاللَّهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوسُفَ ﴾ (یوسف:۸۵) یہاں لفظ ﴿ تَفْتَؤُا ﴾ میں ہمزہ کو واؤ پر لکھا گیا ہے اور اس کے بعد الف زائد کیا گیا ہے تاکہ اس امر پر دلالت کرے کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام سیدنا یوسف کو بہت زیادہ یاد کیا کرتے تھے۔ (ہ) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيهَا وَلَا تَضْحَى ﴾ (طہٰ:۱۱۹) یہاں لفظ ﴿ لَا تَظْمَؤُا ﴾ میں الف زائدہ ہے جو جنتیوں کے لیے سیر ابی کے استمرار اور عدم پیاس پر دلالت کرتا ہے۔ (و) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ ﴾ (الشوریٰ:۳۰) یہاں لفظ ﴿ يَعْفُوا ﴾ میں الف زائدہ ہے جو اللہ کی عفو و درگذر کی کثرت اور استمرار پر دلالت کرتا ہے۔
(ز) بعض مقام پر الف کو مخصوص معانی پر دلالت کرنے کے لیے حذف کر دیا جاتا ہے۔

جیسے: ﴿ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ ﴾ (سباء:۵) میں لفظ ﴿ سَعَوْا ﴾ کا الف محذوف ہے، جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی سعی باطل میں ہے، جس کا کوئی صحیح وجود نہیں ہے اور وہ اس سے کچھ حاصل نہ کر سکیں گے۔

اسی طرح ﴿ وَجَاءُوا بِسِحْرٍ عَظِيمٍ ﴾ (الاعراف:۱۱۶)، ﴿ جَاءُوا ظُلْمًا وَزُورًا ﴾ (الفرقان:۴)، ﴿ وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ﴾ (یوسف:۱۶) اور ﴿ وَجَاءُوا عَلَى قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ ﴾ یوسف:۱۸) ان تمام کلمات میں لفظ ﴿جَآءُوٓ﴾ کے آخر سے الف محذوف ہے۔ جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ان کا آنا صحیح وجہ پر نہیں تھا۔ بلکہ اس پر کذب اور جھوٹ غالب تھا۔

(ج) ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيرًا﴾ (الفرقان:۲۱) یہاں لفظ ﴿وَعَتَوْ﴾ میں واوٗ کے بعد الف محذوف ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ فعل باطل ہے اور اس کے وجود میں کوئی اثر نہیں ہے۔

۷۔ **بعض معانی مختلفہ کی افادیت:** رسم عثمانی کے خصائص میں سے ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ کلمہ کو دو مختلف مقامات پر دو مختلف طریقوں سے لکھا جاتا ہے تاکہ دونوں مقامات پر دو مختلف معانی پر دلالت کرے۔ جیسے: ﴿أم﴾ کو ﴿من﴾ سے مقطوع اور موصول دونوں طرح لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ﴿أَمْ مَنْ يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا﴾ (النساء:۱۰۹) میں ﴿أَمْ﴾ منقطعہ پر دلالت کرنے کے لیے مقطوع لکھا گیا ہے۔

اس کو ﴿أَمْ﴾ منقطعہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے پہلی کلام مکمل ہو جاتی ہے اور اس سے نئی کلام شروع ہوتی ہے۔[1]

جبکہ ﴿أَمَّنْ يَمْشِي سَوِيًّا عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ (الملک:۲۲) میں موصول لکھا گیا ہے تاکہ اس امر پر دلالت کرے کہ یہ مقطوع نہیں ہے۔ یہی وہ اسرار و رموز ہیں جو عقل سلیم اور روشن دل کے ذریعے رسم عثمانی سے مستنبط ہوتے ہیں اور رسم عثمانی کی بقاء کے وجوب اور اس کی ہر حال میں عدم مخالفت پر دلالت کرتے ہیں۔[2]

دوسرے مذہب کے دلائل:

رسم عثمانی کی عدم توقیفیت کے قائلین نے درج ذیل دلائل سے استدلال کیا ہے۔

دلیل نمبرا:

قرآن و سنت میں کوئی ایسی دلیل موجود نہیں ہے جو رسم عثمانی کی توقیفیت پر دلالت کرے، اور قرآن مجید کو کسی دوسرے رسم پر لکھنے سے منع کرے۔

امام ابو بکر الباقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "کتابت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے امت پر کوئی مخصوص شے واجب نہیں کی، اور نہ ہی کاتبین قرآن اور خطاطین مصاحف پر کوئی متعین رسم واجب کیا ہے، کہ اس کے علاوہ کسی دوسرے رسم پر کتابت ناجائز اور حرام ہو۔

رسم عثمانی کے وجوب کا ثبوت یا تو سماع سے ہو سکتا تھا یا توقیف سے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید، سنت رسول، اجماع اور قیاس سے کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جو قرآن کے رسم اور ضبط کو مخصوص کرتی ہو کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا رسم ناجائز اور حرام ہے۔ بلکہ سنت تو کسی بھی آسان رسم کے جواز پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لکھواتے وقت انہیں رسم کی متعین ہیئت بیان نہیں کرتے تھے، اور نہ ہی کسی کتابت سے منع فرماتے تھے، یہی وجہ ہے کہ مصاحف کے خطوط مختلف ہیں۔ بعض صحابہ کلمہ کو اس کے نطق کے مطابق لکھا کرتے تھے تو بعض اس میں کمی زیادتی کر کے لکھتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ کمی و زیادتی کے ساتھ کتابت بھی ایک اصطلاح ہے اور لوگ اس طریقے سے واقف ہیں۔ چنانچہ یہ جائز امر ہے کہ قرآن مجید کو کوفی حروف اور خط اول کے مطابق لکھا جائے اور لام کو کاف کی صورت پر لکھا جائے اور الفات کو ٹیڑھا لکھا جائے یا اس کے علاوہ وجوہ پر لکھا جائے۔

یعنی قرآن مجید کو قدیم وجدید دونوں طرح کے خطوط ورسم کے مطابق لکھنا جائز ہے۔'' جب مصاحف کے خطوط اور حروف مختلف اور متغایر الصورۃ ہیں اور لوگوں کو یہ اجازت تھی کہ ہر شخص بلاگناہ اور انکار کے اپنی عادت کے مطابق لکھ لے جو اس کے نزدیک سہل، مشہور اور اولیٰ ہے۔ لہٰذا لوگوں پر کوئی خاص رسم واجب نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ خطوط نشانات اور علامات ہیں جو اشارات، عقود اور رموز کے قائم مقام ہیں۔ ہر رسم کلمہ پر دلالت کرتا ہے، اس کی قراءت کی صحت کا فائدہ دیتا ہے، اسے کاتب نے جس صورت پر بھی لکھا ہو۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ لوگوں کو مخصوص رسم کا پابند کرنے والوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے دعویٰ پر کوئی دلیل پیش کریں، اور دلیل ندارد؟''[1]

اس دلیل کا رد

مذکورہ دلیل کا درج ذیل امور سے رد کیا گیا ہے:

۱۔ ان کا یہ دعوی کہ قرآن، سنت اجماع اور قیاس سے رسم عثمانی کی توقیفیت پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، باطل اور مردود ہے، کیونکہ پیچھے مذہب جمہور میں ہم اس پر متعدد دلائل پیش کر آئے ہیں۔

۲۔ امام باقلانی رحمہ اللہ کے قول کہ ''چنانچہ یہ جائز امر ہے کہ قرآن مجید کو کوفی حروف اور خط اول کے مطابق لکھا جائے۔'' کا کوئی معنی نہیں ہے اور یہ اس مذہب کے قائلین کو کوئی فائدہ نہیں دیتا، کیونکہ کوفی حروف ان قواعد سے خارج نہیں ہیں، جن پر مصحف لکھا گیا ہے، چنانچہ محل شاہد کہاں ہے؟
۳۔ امام باقلانی رحمہ اللہ کا یہ دعوی کہ ''ہر رسم کلمہ پر دلالت کرتا ہے، اس کی قراءت کی صحت کا فائدہ دیتا ہے اسے کاتب نے جس صورت پر بھی لکھا ہو۔'' اس مذہب کے قائلین کے دعویٰ سے متناقض اور اس کی اساس کو منہدم کرنے والا ہے، کیونکہ قراءت سنت متبعہ ہے اور اس میں توقیف مجمع علیہ اَمر ہے۔

قرآن مجید کو کسی بھی رسم اور طریقے پر لکھنے کے جواز کا قول باطل اور امت کے سلف وخلف سے ثابت نقل صحیح اور تلقی کے مخالف ہے۔

اتحاف فضلاء البشر میں مرقوم ہے: ''اتباع رسم کے وجوب پر ان کا اجماع ہے... کیونکہ اختیاراً واضطراراً ضرورت اس کا تقاضا کرتی ہے... اور یہ امام نافع رحمہ اللہ، امام ابو عمرو بصری رحمہ اللہ، امام عاصم رحمہ اللہ، امام کسائی رحمہ اللہ، امام ابو جعفر رحمہ اللہ اور امام خلف رحمہ اللہ سے نصاً ثابت ہے۔

اس طرح امام اَہوازی رحمہ اللہ نے امام ابن عامر شامی رحمہ اللہ سے نصاً روایت کیا ہے۔ اہل اداء نے باقی قراء کے لیے بھی اسے اختیار کیا ہے۔ بلکہ عراقی اَئمہ نے نصاً و اَداءً تمام قراء سے روایت کیا ہے۔''

دلیل نمبر۲:

ظہور اسلام اور کتابت مصاحف کے وقت عربی خط اپنے عہد طفولیت میں تھا اور کاتبین مصاحف کتابت میں ماہر نہ تھے۔

چنانچہ انہوں نے اس زمانے میں دستیاب قواعد خط کے مطابق مصاحف کو لکھا تھا۔ آج جب خط کے اصول اور کتابت کے قواعد مستحکم ہو چکے ہیں، مصحف کو جدید رسم کے مطابق لکھنے میں کوئی مانع نہیں ہے تا کہ لوگوں پر آسانی کی جاسکے اور مشقت کو دور کیا جاسکے۔[1]

اس دلیل سے مناقشہ:

یہ دلیل اس موقف پر قائم ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کتابت مصاحف میں غلطی کی ہے۔ اس دلیل پر رد پہلے ہی گذر چکا ہے۔ جہاں ہم نے واضح کیاہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن مجید کو بالکل صحیح قواعد کے مطابق لکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے متشابہ کلمات کے درمیان فرق کیاہے۔ چنانچہ انہوں نے ﴿أُولَٰئِكَ﴾ میں واؤ ملحق کی ہے تا کہ اس کے اور ﴿إِلَيْكَ﴾ کے درمیان فرق ہو جائے۔ کیونکہ اس وقت مصاحف نقاط و حرکات سے خالی تھے۔ امام آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسم الخط کے ماہر تھے اور کتابت وعدم کتابت اور وصل وقطع وغیرہ کے تقاضوں کو سمجھتے تھے۔ لیکن انہوں نے حکمت کی بناء پر بعض کلمات میں مخالفت کی ہے۔''[2]

علامہ ابن الجزری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مصحف کی کتابت کرنا، ان کی علم ہجاء میں مہارت اور ہر علم کی تحقیق میں دقت فہم پر دلالت کرتا ہے۔''[1]

کتابت مصاحف میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی غلطی کا دعوی کرنا، وعدہ حفاظت الٰہی سے متعارض ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (الحجر: ۹) ''ہم نے ہی اس ذکر کو نازل فرمایاہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

دلیل نمبر ۳:

قواعد رسم قیاسی کی مخالفت کی وجہ سے رسم عثمانی عامۃ المسلمین کو مشقت میں ڈال دیتی ہے اور کتاب اللہ میں تحریف تک پہنچادیتی ہے، لہٰذا مقاصد عامہ اور قواعد شریعت کے موافق مصلحت پر عمل کرتے ہوئے مصاحف کو جدید رسم قیاسی کے مطابق لکھنا واجب ہے۔

یہ شیخ عزالدین بن عبد السلام رحمہ اللہ کا قول ہے، فرماتے ہیں:

((لَا تَجُوْزُ كِتَابَةُ الْمُصْحَفِ الْآنَ عَلَى الرَّسْمِ الْأَوَّلِ بِإِصْطِلَاحِ الْأَئِمَّةِ. لِئَلَّا يُوْقِعَ فِيْ تَغْيِيْرٍ مِنَ الْجُهَّالِ...))[2]

''اصطلاح ائمہ میں معروف رسم اول (یعنی رسم عثمانی) کے مطابق اب کتابت مصاحف جائز نہیں ہے، تا کہ جہال کی جانب سے اس میں تغییر واقع نہ ہو۔''

اس دلیل پر رد:

امام ابن الحاج رحمہ اللہ اپنی کتاب المدخل میں اس دلیل پر رد کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''یہ علت ناقابل التفات ہے کہ عامۃ المسلمین رسم مصحف سے ناواقف ہیں، اور اس رسم کے مطابق لکھے ہوئے مصاحف سے تلاوت کرتے ہوئے ان سے غلطی سرزد ہوتی ہے، کیونکہ امت کے ہر فرد پر واجب ہے کہ وہ رسم مصحف اور تعلیم قراءت حاصل کرنے کے بعد، مصحف سے تلاوت کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اجماع امت کی مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے۔ جس کا حکم شریعت میں معلوم ہے۔ لہٰذا علت مذکور، اجماع مذکور کی مخالفت کی وجہ سے مردود ہے اور اس زمانے میں یہ مفسدت بہت عام چکی ہے، جس سے ہر آدمی کو بچنا چاہیے۔''[1]

ہم مذہب جمہور کے دلائل میں ان مفاسد کو بیان کر چکے ہیں، جو رسم قیاسی کے مطابق کتابت مصاحف کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ رسم قیاسی ہر دور میں محل تغییر و تبدیلی بنی رہی ہے، اس کے مطابق کتابت سے تحریف کا اندیشہ ہے۔ علاوہ ازیں قراءات صحیحہ... تحقیقاً یا تقدیراً... رسم عثمانی کے ساتھ متفق ہیں۔ اگر مصاحف کو رسم عثمانی کے علاوہ کسی دوسرے رسم پر لکھا جائے تو ان قراءات صحیحہ میں خلل پیدا ہو جائے گا۔

اور قواعد شریعت میں سے ایک قاعدہ ہے: ((دَرْئُ الْمَفَاسِدِ مُقَدَّمٌ عَلیٰ جَلْبِ الْمَنَافِعِ)) ''مفاسد کو دور کرنا منافع کے حصول پر مقدم ہے۔'' لہٰذا جاہلوں کی جہالت کی رعایت کرتے ہوئے، عصر صحابہ سے لے کر آج تک قائم اجماع امت کی مخالفت کرنا کسی طور پر مناسب نہیں ہے۔

اور آج تک کسی مسلمان نے خط مصحف سے عدم معرفت کی شکایت نہیں کی۔ بلکہ اس کے برعکس صحیح ہے۔ جدید قواعد اِملائیہ ہر ملک میں مختلف ہیں، جبکہ رسم عثمانی کسی ملک میں بھی مختلف نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اکثر غیر عرب مسلمان، عربوں سے گفتگو کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے، اور نہ ہی ان کی گفتگو کو سمجھتے ہیں، مگر جب وہ مصحف سے تلاوت کرتے ہیں تو بالکل صحیح اور درست تلاوت کر لیتے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ رسم عثمانی کی یہ امتیازی ہیئت ان کے قلوب و اَذھان میں پختہ اور راسخ ہو چکی ہے۔

تیسرے مذہب کے دلائل

اَصحاب مذہب ھذا کا موقف یہ ہے کہ مصحف شریف کے دو خط ہونے چاہئیں۔ ایک رسم عثمانی کے مطابق خواص کے لیے، اور دوسرا رسم قیاسی کے مطابق عامۃ المسلمین کے لیے۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید کو جہال کی تحریف اور ان کی تلاوت میں غلطی سے محفوظ کر دیا جائے اور اس میں مقاصد شریعت سے متفق مصلحت عامہ ہے۔ امام زرکشی رحمہ اللہ شیخ عزالدین بن عبد السلام سے نقل کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ ((قَالَ الشَّيْخُ عِزُّ الدِّيْنِ بْنُ عَبْدِ السَّلَامِ، لَا تَجُوْزُ كِتَابَةُ الْمُصْحَفِ عَلَى الرَّسُوْمِ الْأُوْلٰى بِإِصْطِلَاحِ الْأَئِمَّةِ فِيْ تَغْيِيْرِ الْجُهَّالِ، وَلٰكِنْ لَّا يَنْبَغِيْ إِجْرَائُ هٰذَا عَلٰى إِطْلَاقِهِ، لِئَلَّا يُؤَدِّيَ إِلٰى دُرُوْسِ الْعِلْمِ، وَشَيْئٌ أَحْكَمَتْهُ الْقُدَمَآئُ لَا يُتْرَكُ مُرَاعَاةً لِجَهْلِ الْجَاهِلِيْنَ، وَلَنْ تَخْلُوَا الْأَرْضُ مِنْ قَآئِمٍ لِلّٰهِ بِالْحُجَّةِ)) [1]

شیخ عزالدین بن عبد السلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصطلاح ائمہ میں معروف رسوم اولی (یعنی رسم عثمانی) پر کتابت مصاحف جائز نہیں ہے، تاکہ اس میں جہال کی طرف سے تغییر واقع نہ ہو لیکن اس کا مطلق اجراء مناسب نہیں ہے، ورنہ ہر شخص کو علمی دروس میں حاضر ہونا پڑے گا، وہ شے جسے قدماء نے ثابت رکھا ہو، اسے جاہلوں کی جہالت کی رعایت کرتے ہوئے ترک نہیں کیا جا سکتا اور اللہ کے لیے دلیل پر قائم رہنے والے افراد سے زمین ہر گز خالی نہیں ہو گی۔"

اس دلیل کا رد:

مذہب ثانی کی دلیل ثالث میں اس پر رد گذر چکا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے قرآن مجید میں شک کا دروازہ کھل جائے گا، جب دو رسم ہوں گے تو ان میں سے صحیح کون سا ہو گا اور غلط کون سا ہو گا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔

راجح قول:

سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں لکھے گئے مصاحف کا رسم توقیفی ہے جو صفحہ نمبر: 99 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا ہے۔ آپ کی طرف جو بھی وحی نازل ہوتی، آپ کاتبین وحی کو منگوا کر اسے لکھوا دیتے، پھر کاتبین اس مکتوب کو آپ کے سامنے پڑھتے، اگر اس میں کوئی نقص وغیرہ ہوتا تو آپ اس کی اصلاح فرما دیتے تھے۔ یہ وہی رسم ہے جس پر سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں قرآن مجید لکھا اور جمع کیا گیا تھا۔ پھر انہی صحف سے یہ مصاحف تیار کیے گئے۔

نیز تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس عمل کی صحت پر اجماع ہے، اسی طرح تابعین، ائمہ مجتہدین اور عصر حاضر تک کے تمام قراء کرام کا اس پر اجماع ہے۔ حتی کہ ائمہ قراءات نے رسم عثمانی کی موافقت، قراءات صحیحہ کی شرائط میں سے ایک شرط مقرر کر دی ہے۔

میرے شیخ عبد الفتاح القاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس بناء پر ہر کاتب، طابع اور ناشر پر واجب ہے کہ وہ قرآن مجید کو رسم عثمانی کے مطابق لکھنے کی کوشش کرے، اور اس میں کوتاہی نہ کرے، اور اس دائمی تراث کی حفاظت اور صحابہ، تابعین وائمہ مجتہدین اور ہر دور کے ائمہ اسلام کی اقتداء کرتے ہوئے نقص وزیادت یا اثبات وحذف کے ذریعے اس میں کوئی تبدیلی نہ کرے۔

اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ مکمل مصاحف ہوں، یا بڑوں اور بچوں کی تعلیم کے لیے اجزاء پر مشتمل چھوٹے مصاحف ہوں۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ بچپن ہی سے رسم عثمانی کی معرفت حاصل کریں اور معلمین قرآن، جہاں بھی ہوں، ان پر لازم ہے کہ وہ بچپن ہی سے اپنے پاس پڑھنے والے بچوں کو ان قواعد کی تعلیم دیں، یہاں تک کہ رسم عثمانی کی تعلیم اتنی عام ہو جائے کہ مصحف سے تلاوت کرنا ان کے لیے کوئی مشکل نہ رہے۔"[1]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے متعلق قرآن مجید کی آیات ارشادِ ربانی ہے:

﴿ قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللَّهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ . مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ثُمَّ إِلَى رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ﴾

"کہہ دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے کہ معاف کریں ان لوگوں کو جو امید نہیں رکھتے اللہ کے دنوں کی تاکہ وہ سزا دے ایک قوم کو اس کی جو وہ کسب کماتے تھے۔ جس نے عمل کیا صالح تو اپنے واسطے اور جس نے برائی کی تو اپنے حق میں، پھر تم اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔" [1]

اِن آیات کے متعلق مفسرین کے اقوال: بعض اہلِ تفسیر جن میں قرطبی، بغوی، طبری اور واحدی جیسے ائمۂ تفسیر شامل ہیں، انھوں نے اپنی اپنی تفاسیر میں لکھا ہے کہ یہ آیات حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھیں۔[2]

یہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کون ہیں؟ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ وہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں سو رہا تھا کہ میں نے خود کو ایک کنویں پر دیکھا۔ کنویں پر ایک ڈول لٹکتا تھا۔ میں نے وہ ڈول لیا اور اس سے پانی کھینچا جتنا اللہ نے چاہا، پھر وہ ڈول ابن ابی قحافہ نے لیا اور ایک ڈول یا دو ڈول پانی کھینچا۔ ان کے پانی کھینچنے میں قدرے ضعیفی تھی۔ اللہ تعالیٰ انھیں معاف کرے۔ ان کے بعد عمر آئے۔ انھوں نے پانی کھینچا تو وہ ڈول، بڑے ڈول میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے ایسا شاہ زور پہلوان نہیں دیکھا جو عمر کی طرح ڈول کھینچ سکتا۔ انھوں نے اتنا پانی کھینچا کہ سب لوگوں نے خوب سیر ہو کر پانی پی لیا اور اپنے اونٹوں کو سیر اب کر کے ان کے باڑوں میں لے گئے۔" [1]

[1]صحيح البخاري، حديث: 3682,3664، و صحيح مسلم، حديث: 2392-کتاب: رجال القرآن 1

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

آدمیت کی کان سے نکلا ایک کامل آدمی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کی گھاٹیوں میں بھاگتے دوڑتے دیکھا تو تمنا کی کہ کاش اللہ تعالیٰ اِس آدمی کا دل اسلام کی روشنی سے منور کر دے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا بھی فرمائی کہ بارے الٰہا! ابو جہل بن ہشام اور عمر بن خطاب میں سے جو تجھے محبوب ہے اُسے اسلام کی توفیق دے کر اسلام کو تقویت عطا فرما۔[1]

ایک ایسا بہادر جو بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا دیتا اور عکاظ کے میلے میں عرب کے بڑے بڑے پہلوانوں کو پچھاڑ ڈالتا تھا۔ نہایت تقویٰ شعار اور عبادت گزار۔ ام ابان نے ایک مرتبہ اس کے متعلق کہا: "وہ ایسا آدمی ہے جسے آخرت کی فکر نے دنیا کے افکار سے بیگانہ کر رکھا ہے، گویا وہ اپنے رب کو دونوں آنکھوں سے دیکھتا ہے۔"

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مکہ کی سنگلاخ وادی میں پرورش پائی تھی۔ وادی مکہ کی دہکتی فضا اور تیز دھوپ نے اس کی رنگت سنولا ڈالی تھی۔ اِس وادی کے آزاد ماحول، سخت پتھروں اور اونچے خشک پہاڑوں نے اُس کی جفاکشی کو خوب پروان چڑھایا تھا۔ وہ جوان ہوا اور بازوؤں میں دم آیا تو اس نے تیر اندازی، نیزہ بازی اور گھڑ سواری کے

[1]جامع الترمذي، حديث: 3681-

فنون میں مہارت تامہ بہم پہنچائی۔ ان فنون میں کمال پیدا کرنا مکہ کے نوجوانوں کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔

عمر کا والد خطاب نہایت تند خو اور سخت گیر آدمی تھا۔ عمر دن بھر خطاب کے اونٹ چراتا اور تھک کر بیٹھ جاتا تو خطاب اسے زدو کوب کرتا۔ خطاب کی سخت گیری عمر بھر اُس کی یادوں کا حصہ رہی۔ خطاب کٹر بت پرست تھا۔ چراگاہ کے اونٹ، صحرائے مکہ اور اصنامِ کعبہ، یہ تھی خطاب کی کل کائنات۔ وہ بڑے اہتمام سے بتوں کی پوجا کرتا، ان کی خوب آؤ بھگت کرتا، ان کی بھینٹ چڑھاتا۔ اس کے بھتیجے زید بن عمرو بن نفیل نے بتوں کی پوجا کرنی چھوڑ دی تھی۔ اب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین حنیف کی تلاش میں مکہ سے نکل جانا چاہتا تھا۔ خطاب کو پتہ چلا تو اس نے صفیہ بنت حضرمی سے زید کی نگرانی کرنے کو کہا۔ زید جونھی رختِ سفر باندھ کر گھر سے نکل بھاگنے کی تیاری کرتا، صفیہ دوڑی ہوئی جاتی اور خطاب کو خبر کرتی۔ خطاب آتا، زید کو ڈراتا دھمکاتا اور جانے سے منع کر دیتا۔ اس نے جب دیکھا کہ زید ٹلنے کا نہیں تو اس نے زید کو حرا کے قریب مکہ کے پہاڑوں میں محبوس کر دیا اور قریش کے چند اوباشوں کو روانہ کیا کہ وہ زید کی نگرانی کریں اور یہ بھی دھیان رکھیں کہ وہ نہ تو سفر پر جانے پائے نہ مکہ میں داخل ہو سکے اور نہ لوگوں سے میل ملاپ کرنے پائے۔ مبادا وہ دوسرے لوگوں کی زندگی بھی خراب کر ڈالے۔[1]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ایک بھائی زید بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ بدر، اُحد، خندق سمیت تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ یمامہ میں لڑتے ہوئے مرتبۂ شہادت

[1]السيرة النبوية لابن بشام:1،149-

پر فائز ہوئے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو ان کے بچھڑنے کا بے حد غم تھا۔ آپ ہمیشہ کہا کرتے: "جب بھی بادِ صبا چلتی ہے، مجھے زید کی خوشبو آتی ہے۔ وہ دو نیکیوں میں مجھ پر سبقت لے گیا۔ وہ مجھ سے پہلے اسلام لایا تھا اور مجھ سے پہلے شہید ہوا۔" [1]

عمران عبدی کے والد کا بیان ہے کہ میں نے ایک روز عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں صبح کی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد وہ مسجد سے نکلنے لگے تو ایک پستہ قد آدمی سے ملاقات ہوئی جو ایک آنکھ سے کانا تھا۔ اس نے کمان کندھے پر لٹکا رکھی تھی۔ ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے؟ میں نے بتایا کہ یہ متمم بن نویرہ ہے۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ ذرا وہ شعر تو سناؤ جو تم نے اپنے بھائی کے مرثیے میں کہے تھے۔ متمم بن نویرہ نے حسبِ ارشاد یہ شعر پڑھے:

وَكُنَّا كَنَدْمَانَيْ جُذَيْمَةَ حِقْبَةً

مِنَ الدَّهْرِ، حَتّٰى قِيلَ لَنْ يَتَصَدَّعَا

’’ہم دونوں عرصے تک جذیمہ کے دو ہم مشرب ساتھیوں کی طرح اکٹھے رہے، کچھ اس طرح کہ لوگوں نے کہا یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوں گے۔‘‘ ف

لَمَّا تَفَرَّقْنَا كَأَنِّي وَمَالِكًا

لِطُولِ اجْتِمَاعٍ لَمْ نَبِتْ لَيْلًا مَعَا

’’لیکن جب ہم جدا ہوئے تو مدتِ دراز ساتھ ساتھ رہنے کے باوجود یوں معلوم ہوتا تھا کہ میں اور مالک کبھی ایک دن کے لیے بھی اکٹھے نہیں رہے۔‘‘
عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تو جھوم اٹھے۔ فرمایا: بخدا مرثیہ تو اِسے کہتے ہیں، پھر کہنے لگے

[1]الاستيعاب في معرفة الأصحاب:553/2

اللہ تعالیٰ زید بن خطاب رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے، اگر میں شعر کہنے پر قادر ہوتا تو جس طرح تم نے اپنے بھائی کا مرثیہ کہا ہے، میں بھی اس کا مرثیہ کہتا۔ معلوم ہوتا ہے، تم نے اپنے بھائی کا بہت غم کھایا ہے۔ متمم بولا اجی! پوچھیے ہی نہیں۔ اتنا رویا ہوں، اتنا رویا ہوں کہ کوئی کیا رویا ہو گا۔ یہ آنکھ جو آپ کو کانی دکھائی دیتی ہے، اچھی بھلی تھی۔ روتے روتے چلی گئی۔ جب یہ چلی گئی تو جو سلامت بچی، اس سے آنسو بہائے۔ اتنے آنسو بہائے کہ جو آنکھ چلی گئی تھی وہ بھی دوسری آنکھ کی مدد کرنے اور رونے لگی۔

عمر بن خطاب نے متعجب ہو کر فرمایا بھئی واقعی! یہ تو بڑا ہی شدید غم ہے۔ کسی نے اپنے مرنے والے کا ایسا غم کیونکر کھایا ہو گا۔ متمم نے کہا جی ہاں لیکن ایک بات میری بھی سن لیجیے۔ آپ کے بھائی کی طرح میرا بھائی یمامہ کی جنگ میں شہید ہوتا تو میں اس کے لیے کبھی نہ روتا۔

امیر المومنین کو اس کی یہ بات نہایت بھلی معلوم ہوئی۔ دل کو بے حد تسلی ملی۔ فرمایا: جیسی اچھی تسلی تم نے دی ہے، آج تک کسی نے نہیں دی۔[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک فرزند حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ تھے۔ نہایت نیک طبع اور بہت عبادت گزار۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے متعلق ایک مرتبہ ان کی بہن ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تمھارا بھائی عبد اللہ اچھا آدمی ہے۔ کاش! وہ تہجد کی نماز پڑھا کرے۔[2]

کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کبھی تہجد کی نماز نہیں چھوڑی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ محترمہ ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

[1]الاستيعاب في معرفة الأصحاب:553/2- [2] صحيح البخاري، حديث: 1122-

کی دختر تھیں۔ بڑی عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں۔ ان کے متعلق حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطورِ خاص بتایا تھا کہ وہ اہل جنت میں سے ہیں۔[1]

جاہلیت کا عمر بن خطاب شہر مکہ کا باسی تھا۔ بطحائے مکہ ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ وہ مکہ کے گرد ونواح میں دن دن بھر خطاب کے اونٹ اور اپنے بعض اقارب کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ وہ پینے پلانے کا شغل بھی رکھتا اور جم کر پیتا تھا۔ مکہ کے دیگر نوجوانوں کی طرح وہ بھی عکاظ کے میلے میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوتا۔ شہ زور ہونے کے ناتے عکاظ کے دنگل میں خم ٹھونکتا اور بڑے بڑے پہلوانوں سے پنجہ لڑاتا۔ پڑھا لکھا تھا اور شعر وشاعری کے ذوق سے آشنا۔ عکاظ میں شعر وشاعری کی جو محفلیں آراستہ ہوتیں، ان میں شرکت کرتا اور نہایت توجہ سے شعر سنتا۔ یوں اُس کی زندگی اور زندگی کی تمام سرگرمیاں مکہ کے دیگر باسیوں کے مقابلے میں مختلف نہیں تھیں۔

اسلام کے زیر سایہ

عمر بن خطاب نے اسلام کیونکر قبول کیا اور اسلام ان کے دل میں کیسے جاگزیں ہوا، آیئے یہ ماجرا خود ان کی زبانی سنتے ہیں۔ ان کا بیان ہے: ''میں اسلام سے بہت دور تھا۔ اسے قریب نہیں آنے دیتا تھا۔ جاہلیت میں جم کر شراب پیا کرتا تھا۔ شراب سے مجھے بڑا پیار تھا اور میں پی کر پھولے نہ سماتا تھا۔ ہماری بادہ خوری کی محفل میں قریش کے نامی سردار شریک ہوتے تھے۔ ایک رات یہی ارادہ کر کے گھر سے نکلا کہ چل کے دوستوں میں بیٹھتے اور ذرا پیتے پلاتے ہیں۔ اس جگہ پہنچا جہاں ہماری محفل جمتی تھی۔ آج کوئی ندیم نہیں آیا

[1]صحيح الجامع، حديث: 4351۔

تھا۔ میں بھی چل دیا۔ سوچا مے کدے میں جاتا اور شوق پورا کرتا ہوں۔ وہاں پہنچا تو مے کدہ بھی ویران پڑا تھا۔ پینے پلانے کو کچھ نہیں تھا۔ دل میں آیا چلو آج مے کدہ نہیں تو مسجد ہی سہی۔ کعبہ چلتے اور طواف کرتے ہیں، چنانچہ مسجد میں پہنچا۔ طواف کرنا چاہتا تھا کہ ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے دکھائی دیے۔ نماز پڑھ رہے تھے۔ معمول تھا کہ نماز پڑھتے تو شام کی طرف منہ کرتے۔ کعبہ آپ کے اور شام کے درمیان ہوتا۔ جائے نماز حجر اسود اور رکن یمانی کے بیچ تھی۔ دل میں کہا آج سنتا ہوں ذرا کہ محمد کیا پڑھتے رہتے ہیں۔ قریب ہو کر سنتا ہوں۔ مجھے دیکھیں گے تو گھبرا اٹھیں گے۔ میں حطیم کی جانب سے گیا اور غلافِ کعبہ میں چھپ کر دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں کھڑے قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے۔ میں غلافِ کعبہ کی اوٹ میں چلتا ہوا بالکل روبرو آگیا۔ اب میرے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیچ صرف غلافِ کعبہ تھا۔ میں نے قرآن کی تلاوت سنی تو دل نرم پڑ گیا اور میں رو دیا۔ اسلام نے میرے دل میں جگہ بنالی۔'' [1]

قرآن مجید کی آیات سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دل آخر کیونکر نرم نہ پڑتا۔ وہ تو بڑے صاحبِ ذوق اور فصیح وبلیغ آدمی تھے۔ زبان وبیان کی نزاکتوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ اچھا اسلوب بیان انھیں متاثر کیے بنا نہیں رہتا تھا، پھر یہ تو کلامِ الٰہی تھا جس کی فصاحت وبلاغت کے آگے عرب کے بڑے بڑے فصیحوں کی زبانیں گنگ تھیں۔ تلاوت بھی کیسی! خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے اور مسحور کن لہجے میں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

[1]السيرة النبوية لابن ہشام:1/368۔

کو تو متأثر ہونا ہی تھا۔ یہ وہ بابرکت لمحے تھے کہ عمر بن خطاب نے نیا جنم لیا۔ انھوں نے زندگی کے نئے اور انوکھے کارزار میں قدم رکھا۔ آیاتِ قرآنی نے ان کا دل پاکیزہ کر دیا اور ان کی کایاپلٹ ڈالی تھی۔ ان سے بھی پہلے قریش کے اصحاب سخن اور اساتذۂ کلام نے قرآنی آیات سن کر قرآن مجید کی معجز بیانی کا دم بھرا اور اس کی فصاحت و بلاغت کا لوہا مان کر اسلام قبول کیا تھا۔

مثال کے طور پر جاہلیت کے ممتاز شاعر لبید بن ربیعہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ لبید بن ربیعہ کا شمار دورِ جاہلیت کے سات بہترین شعرائے عرب میں ہوتا ہے۔ یہ سات شاعر سخن گوئی کے بلند ترین معیار پر پورے اترے تھے۔ دورِ جاہلیت میں مکہ کے قریب ہر سال عکاظ کا روایتی میلہ منعقد ہوتا تھا۔ عرب کے مانے ہوئے سخن ور اس میلے میں اپنا تازہ کلام لے کر آتے۔ شعر و شاعری کی محفلیں آراستہ ہوتیں۔ عرب کے ممتاز نقادانِ فن انجمن آرا ہوتے۔ شعرا کا کلام سنتے اور اُسے انتقادِ شعری کی کسوٹی پر رکھ کر پرکھتے۔ جس شاعر کا کلام مطلوبہ معیار پر پورا اترتا اسے زریں حروف میں لکھ کر بابِ کعبہ پر آویزاں کر دیا جاتا۔ ایسے قصائد مَعَلَّقَاتٌ کہلاتے۔ معلقات کی تخلیق کا اعزاز عرب کے بہت کم شاعروں کو حاصل ہوا۔ اس دور کے سات معلقات مشہور ہیں۔ ان میں ایک معلقہ لبید بن ربیعہ کی شاہکار تخلیق ہے۔ پر شکوہ الفاظ، پختہ اسلوب بیان، حکمت و دانائی اور نازک خیالی لبید کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس کی شاعری میں بدوی پندار اور کھرے پن کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔

لبید نے لوگوں کی زبانی سنا کہ محمد نے دعویٰ کیا ہے، جو کلام وہ لے کر آیا ہے اس جیسا کلام عرب کا کوئی بڑے سے بڑا فصیح بھی تخلیق نہیں کر سکتا۔ اگر کسی میں دم ہے تو میدان میں آئے۔ لبید نے اِس کے جواب میں چند شعر کہے اور کاغذ پر لکھ کر بابِ کعبہ پر آویزاں کر دیے۔ کسی مسلمان کی نظر پڑی تو اس نے طیش میں آکر چند آیات قرآنی کاغذ پر تحریر کیں اور ان شعروں کے برابر میں آویزاں کر ڈالیں۔ اگلے روز لبید حرمِ کعبہ میں آیا۔ اپنے کلام کے برابر میں لٹکتی آیات پڑھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بول اٹھا کہ بخدا یہ کسی آدمی کا کلام نہیں۔ میں اس کے آگے سر جھکاتا ہوں۔ (میں مسلمان ہوتا ہوں۔) [1]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اسلام کے قریب آنے کا ایک باعث یہ بھی بنا کہ جب مسلمانوں نے مشرکین مکہ کی ایذا رسانیوں سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کی تو مہاجرینِ حبشہ میں وہ افراد بھی شامل تھے جن کا تعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دوست قبیلے سے تھا۔ انھیں دوستوں کی ہجرت سے سخت صدمہ پہنچا۔ انھوں نے سوچا کہ یہ افراد جس دین کی خاطر گھر بار چھوڑنے کو تیار ہو گئے ہیں وہ یقیناً سچا دین ہو گا۔

ام عبد اللہ بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہا بھی مہاجرین حبشہ میں شامل تھیں۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حلیف قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں سواری پر بیٹھے دیکھا تو پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے۔ ام عبد اللہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ ہم گھر بار چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ تم نے ہم پر بہت ظلم ڈھایا ہے۔ ہم اللہ کی زمین میں نکل جائیں گے اور تب تک نہیں لوٹیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کوئی اور راہ نہیں نکال دیتا۔ اتنا کہہ کر وہ چل دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں خیر و عافیت کی دعا دی اور چلے آئے۔ بعد ازاں ام عبد اللہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر عامر سے اِس کا ذکر کیا اور خیال ظاہر کیا کہ شاید عمر بن خطاب کو ہمارا ہجرت کرنا اچھا نہیں لگا اور وہ پریشان ہوا ہے۔ عامر نے اُن سے کہا کہ شاید تم

[1] المذاہب المعاصرة و موقف الإسلام منها، ص: 146۔

سمجھتی ہو، وہ اسلام قبول کرلے گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جی ہاں! مجھے تو یوں ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس پر عامر نے کہا یہ تو ممکن ہے کہ خطاب کا گدھا اسلام لے آئے لیکن یہ ممکن نہیں کہ خطاب کا بیٹا مسلمان ہوجائے۔[1]

لیکن ام عبد اللہ کی بات سچ نکلی اور عمر بن خطاب نے اسلام قبول کرلیا۔ دورِ جاہلیت کا ایک دانش مند آدمی جسے اسلام نے کیا حاصل کیا، پوری انسانیت نے قیامت تک کے لیے اسے اپنالیا۔ ایک خردمند روح جو ضائع ہونے کو تھی، اپنے بدن میں واپس آئی تو اسے اندھیرا اجالا الگ الگ دکھائی دینے لگا۔ اس نے نہ صرف پوری امت کو بلکہ پوری انسانیت کو فائدہ پہنچایا۔ اسلام کے لیے اُس نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے کہ رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔ دوسری اقوام نے اس کے کارہائے نمایاں دیکھے تو انگشت بدنداں رہ گئیں۔ انھوں نے دیکھا اور جانا کہ جب روحِ انسانی بالیدگی کی بلند سطح پر پہنچتی ہے تو کیسی کیسی مہمات سر کرتی اور کیسے کیسے طوفانوں سے ٹکراتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی ملاحظہ کیا کہ عدل و انصاف اور حق پرستی زندگی کا مزاج کیسے بن جاتے ہیں۔ انھوں نے مشاہدہ کیا کہ گوشت پوست کا آدمی محض عدل و انصاف کا بول بالا کرنے کے لیے کیسے جیتا ہے۔ گویا وہ عدل و انصاف ہی کے لیے جاگتا اور سوتا ہے۔ گویا وہ ظلم و ستم مٹانے کے لیے سانس لیتا ہے۔ گویا وہ عدل و انصاف کا مقروض ہے۔ عدل و انصاف اس سے قرض چکانے کا مطالبہ کررہے ہیں اور وہ اس فکر میں گھل رہا ہے کہ اسے ہر حال میں یہ قرض چکانا ہے۔[2]

آخر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اسلام لے آئے۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے

[1]الكامل لابن الأثير:2، 84- [2] موسوعة العقاد الإسلامية، ص: 385-

چاہا کہ دنیا کو علانیہ بتادیں کہ وہ مسلمان ہوگئے ہیں، چنانچہ قریش کی ایک محفل میں انھوں نے کسی سے پوچھا کہ مکہ کا کون آدمی ڈھنڈورا پیٹنے میں سب سے تیز ہے۔ جمیل بن معمر جمحی کا نام لیا گیا۔ وہ سیدھے جمیل کے ہاں پہنچے اور اسے بتایا کہ میں نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ جمیل نے جونھی یہ بات سنی، اٹھ کھڑا ہوا۔ حرمِ کعبہ میں پہنچا اور بلند آواز سے پکارا: "قریش کے لوگو! سن لو، عمر بن خطاب بے دین ہوگیا۔"

خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس کے پیچھے پیچھے حرم کعبہ میں گئے اور آپ نے بلند آواز سے کہا: "یہ جھوٹ بولتا ہے۔ میں تو اسلام لایا ہوں۔ میں نے شہادت دی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔" یہ اعلان سنتے ہی عتبہ بن ربیعہ ان کی طرف لپکا۔ وہ بھی ہوشیار کھڑے تھے۔ دونوں میں پنجہ آزمائی ہونے لگی۔ مضبوط و توانا عمر رضی اللہ عنہ نے عتبہ کو چاروں شانے چت کرڈالا اور اس کے دیدوں میں انگلیاں گھسیڑ کر بولے: "نکال دوں گا یہ دیدے کہ انھیں روشنی دکھائی نہیں دیتی۔"

یہ منظر دیکھ کر کئی اور لوگ آستینیں چڑھائے ان کی طرف بڑھے تاہم جو بھی ان کے قریب آیا، انھوں نے روئی کی طرح دھنک ڈالا۔ لڑتے بھڑتے خاصی دیر ہوگئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھک کر بیٹھ گئے۔ اہل قریش سر پر آکھڑے ہوئے۔ انھیں برا بھلا کہنے لگے۔ فرمایا: "جو جی میں آئے، کرو۔ بخدا! اگر ہم تین سو آدمی ہوتے تو مکہ میں یا ہم رہتے یا تم۔" [1]

اتنے میں قریش کا ایک معمر سردار ادھر آنکلا۔ وہ نہایت بیش قیمت، مرصع و منقش قمیص اور عمدہ یمنی چادر زیب تن کیے تھا۔ بولا: "کیا بات ہے؟"

[1]أسد الغابة:4،56، والسيرة النبوية لابن ہشام:1،219۔

لوگوں نے کہا: "عمر بے دین ہوگیا ہے۔" "تو کیا ہوا؟!" معمر سردار نے پختہ لہجے میں کہا۔ ایک آدمی نے اپنے لیے ایک بات پسند کی تو تمھارا کیا گیا؟! کیا سمجھتے ہو تم! بنوعدی اپنے آدمی کو یوں تمھارے حوالے کر دیں گے اور تم سے کچھ باز پُرس نہیں کریں گے؟! ہٹ جاؤ یہاں سے۔ چھوڑ دو اُسے۔" بوڑھے سردار کے کہنے پر لوگوں کی بھیڑ یوں چھٹ گئی جیسے کوئی کپڑا تھا جسے یکبارگی کھینچ کر اتار دیا گیا۔ سردار کا نام تھا، عاص بن وائل سہمی۔[1] یہاں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں، چاہے مر جائیں، چاہے جیتے رہیں۔ فرمایا: "کیوں نہیں! قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم بلاشبہ حق پر ہو، زندہ رہو یا نہ رہو۔" عرض کیا تو پھر چھپ کر رہنے کا کیا مطلب ہے۔ قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، ہم تو ضرور باہر نکلیں گے، چنانچہ رہروانِ جادۂ حق کی دو صفیں بن گئیں۔ ایک میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جلوہ افروز ہوئے اور دوسری میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جلو میں آگے بڑھے۔ بڑا دیدنی منظر تھا یہ۔ وہ جوش و جذبہ سے قدم اٹھاتے ہوئے حرم کعبہ میں داخل ہوئے۔ اہل قریش نے یہ منظر دیکھا تو ان کے چہروں پر مردنی چھاگئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے کسی ادنیٰ واعلیٰ کو جرأت نہ ہوئی کہ ان کے قریب پھٹکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فاروق کا لقب دیا۔ فاروق جس

[1]السيرة النبوية لابن ہشام:1،349۔

نے حق و باطل میں فرق کر دکھایا تھا۔ ان کے متعلق ان کے دوست حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا کہنا تھا: "جب عمر اسلام لائے، ہمارا اثر و رسوخ قائم ہوگیا۔[1] ان کا قبولِ اسلام (اسلام کی) فتح تھی۔ ان کی ہجرت (اللہ کی) نصرت اور ان کی خلافت (اللہ کی) رحمت تھی۔ جب تک عمر اسلام نہ لائے، ہم بیت اللہ میں کھلے عام نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔" [2]

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ جب عمر نے اسلام قبول کیا تو ہم بیت اللہ کے گرد بے روک ٹوک مجلسیں آراستہ کرنے لگے۔ تب ہم نے کھلے عام کعبہ کا طواف کیا اور جن لوگوں نے ہم پر ظلم کیا تھا، ان سے ہم نے انتقام لیا۔[3]

ہجرت مدینہ

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اجازت دے دی کہ یثرب کی طرف ہجرت کر جائیں، چنانچہ جونہی رات کی تاریکی چھاتی، وہ دبے پاؤں مکہ سے نکلتے اور تیزی سے سفر کرتے ہوئے یثرب پہنچ جاتے۔ بعض افراد ٹولیوں کی شکل میں نکلتے اور بعض فرداً فرداً ہجرت کا یہ طویل سفر طے کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ہشام بن العاص رضی اللہ عنہ سے یہ طے کیا کہ وہ تینوں ہجرت کا سفر اکٹھے طے کریں گے۔ آغاز سفر کے لیے مکہ سے دس میل دور واقع دیار بنی غفار کا انتخاب کیا گیا اور یہ طے پایا کہ تینوں وقت مقررہ پر وہاں پہنچیں گے۔ جو آدمی وہاں نہیں پہنچ پایا، باقی دونوں اس کا انتظار کیے بغیر سفر کا آغاز کریں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

[1]صحيح البخاري، حديث: 3684- [2] تاريخ الخلفاء، ص: 45، و طبقات ابن سعد:1،193- [3] الرياض:1،195، تفس

اور حضرت عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ تو وقت مقررہ پر وہاں جا پہنچے۔ حضرت ہشام رضی اللہ عنہ کو مکہ میں محبوس کر دیا گیا۔ وہ غزوۂ خندق کے بعد نجات پا کر مدینہ پہنچے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن کا انتظار کیے بغیر رفیق سفر حضرت عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ سفر کا آغاز کیا اور یثرب پہنچ گئے۔ یثرب میں یہ دونوں مہاجر رفاعہ بن منذر کے ہاں ٹھہرے ہی تھے کہ ابو جہل اور حارث بھی وہاں پہنچ گئے۔

انھوں نے حضرت عیاش رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تمھارے آنے کے بعد تمھاری والدہ نے نذر مان لی ہے کہ جب تک تمھیں نہیں دیکھے گی، نہ تو سائے میں بیٹھے گی نہ سر کو خوشبو لگائے گی۔ حضرت عیاش رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا۔ آپ نے فرمایا: "واللہ! یہ تمھیں تمھارے دین سے ہٹانا چاہتا ہے، اس لیے ہوشیار رہو اور اس کی باتوں میں مت آؤ۔ تمھیں اس کے ساتھ نہیں جانا چاہیے۔ تمھاری ماں کو سر کی جوؤں نے ستایا تو وہ خود ہی کنگھی پٹی کر لے گی۔ مکہ کی تیز دھوپ سے تنگ آ کر سائے میں بھی بیٹھے گی۔"

حضرت عیاش رضی اللہ عنہ نے کہا: "مکہ میں میرا کچھ روپیہ بھی رہ گیا ہے۔ شاید میں وہ روپیہ حاصل کر لوں اور وہ مسلمانوں کے کام آئے۔ یوں میں اپنی والدہ کی منت بھی پوری کر لوں گا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "تم جانتے ہو کہ میرا شمار قریش کے مالدار افراد میں ہوتا ہے۔ میں اپنا آدھا روپیہ تمھیں دیتا ہوں لیکن ان کے ساتھ مت جاؤ۔" حضرت عیاش رضی اللہ عنہ نے بہر صورت ان کے ہمراہ جانا چاہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "کسی طرح نہیں ٹلتے تو میری اونٹنی لیتے جاؤ۔ بڑی عمدہ اور جم کر چلنے والی اونٹنی ہے۔

اس پر سوار رہنا۔ ان لوگوں کی نیت میں فتور نظر آئے تو اونٹنی بھگا لینا۔" حضرت عیاش رضی اللہ عنہ اطمینان سے ان کے ساتھ چلے آئے۔ راستے میں جب وہ جبل صبحان پر پہنچے تو مکار ابو جہل نے حضرت عیاش رضی اللہ عنہ سے کہا: "میرے بھائی! میرا اونٹ تو بڑا سخت ہے۔ تم مجھے اپنی اونٹنی پر بٹھا لو۔" حضرت عیاش رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: "ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے اونٹنی کو فوراً بٹھا دیا اور زمین پر اتر آئے۔ وہ دونوں اپنی اپنی سواریوں سے اترے، حضرت عیاش رضی اللہ عنہ کی طرف لپکے اور اُن کی مشکیں کس دیں۔ اُنھیں اسی حالت میں ساتھ لیے مکہ پہنچے اور لوگوں سے کہنے لگے: "اہلِ مکہ! اپنے اپنے احمقوں پر یہی داؤ آزماؤ جو ہم نے آزمایا۔" پھر انھوں نے حضرت عیاش رضی اللہ عنہ کو قید خانے میں ڈال دیا۔[1]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ جہاں تک میں جانتا ہوں، عمر بن خطاب کے سوا تمام مہاجرین نے دبے پاؤں ہجرت کی تھی۔ عمر بن خطاب نے جب ہجرت کے لیے رختِ سفر باندھا تو تلوار اٹھائی، کمان کندھے پر رکھی، ترکش میں سے چند تیر نکال کر ہاتھ میں لیے اور حرمِ کعبہ میں گئے۔ قریش کے سردار معمول کی مجلسوں میں بیٹھے تھے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے دھڑلے سے بیت اللہ کا طواف کیا۔ سات پھیرے لگا کر مقامِ ابراہیم پر آئے اور نماز پڑھی، پھر فرداً فرداً سردارانِ قریش کی تمام ٹولیوں میں کھڑے ہو کر بآوازِ بلند کہا: "یہ چہرے بد نما ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ انھی چہروں کو رسوا کرے۔ جو آدمی اپنی ماں کو بے اولاد، اپنی اولاد کو یتیم اور اپنی بیوی کو بیوہ کرنا چاہے وہ وادی کی دوسری طرف مجھ سے ملاقات کر لے۔"

[1]طبقات ابن سعد:194،1، والسیرۃ النبویۃ لابن ہشام:288،1۔

چند بے بس اور کمزور مسلمان ہی ان کے پیچھے گئے۔ عمر بن خطاب نے انھیں ضروری ہدایات دیں۔ انھیں بتایا کہ وہ کافروں کے چنگل سے کیونکر نکل سکتے ہیں، پھر وہ یثرب کی راہ پر گامزن ہو گئے۔[1]

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں

مدینہ منورہ میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اسلام کے جانباز سپاہی بن کر زندگی گزارتے رہے۔ وہ حلقۂ یاراں میں بیٹھتے تو بریشم کی طرح نرم ہوتے۔ رزمِ حق و باطل میں خدا کے دشمنوں سے ٹکراتے تو فولاد کی مانند سخت اور ناقابلِ شکست ہوتے۔ بڑے دانش مند اور سمجھدار آدمی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہم معاملات میں ان کی رائے ضرور لیتے اور ان کا مشورہ اکثر قبول فرماتے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ جو رائے دیتے، اس کی تائید میں قرآنی آیات نازل ہوتیں۔

معرکۂ بدر اختتام کو پہنچا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر، حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم سے رائے طلب کی کہ بدر کے قیدیوں سے کیا سلوک کرنا چاہیے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! یہ قیدی ہمارے عم زاد، اہلِ خاندان اور ہمارے بھائی بند ہی تو ہیں۔ میری رائے اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہم ان سے فدیہ لے کر انھیں آزاد کر دیں۔ فدیے کی رقم ہمارے کام آئے گی اور بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت دے دے اور یہ ہمارے دست و بازو بن جائیں۔ ان کی رائے سن کر آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا اور فرمایا: "ابن خطاب! آپ کی کیا رائے ہے؟"

[1]الرياض النضرة، وأسدالغابة:58/4۔

انھوں نے جواب دیا: "نہیں، اللہ کی قسم! میری رائے وہ نہیں جو ابو بکر نے ظاہر کی ہے۔ میری رائے تو ان قیدیوں کے متعلق یہ ہے کہ مجھے فلاں قیدی پر اختیار دیجیے تو میں اس کی گردن مار ڈالوں۔ عباس کو حمزہ کے سپرد کیجیے، وہ اس کی گردن اڑا دیں۔ عقیل کو علی کے حوالے کیجیے کہ وہ اس کا سر تن سے جدا کر ڈالیں تا کہ پتہ چل جائے کہ کافروں کے لیے ہمارے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں۔ یہ سب کافروں کے سردار اور ان کے قائدین ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی رائے پسند آئی اور آپ نے اسی کے موافق فیصلہ کیا۔[1]

اگلی صبح حضرت عمر رضی اللہ عنہ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی حاضر خدمت تھے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ دونوں بیٹھے رو رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ منظر دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ عرض کیا: "یارسول اللہ! مجھے بتائیے، آپ دونوں کیوں رو رہے ہیں۔ اگر رونے کی بات ہے تو میں بھی روؤں ورنہ آپ کو روتا دیکھ کر ہی آنسو بہاؤں۔"

فرمایا: "تمھارے ساتھیوں نے یہ رائے دی تھی کہ فدیہ لے کر قیدیوں کو آزاد کر دوں، وہی بات رلاتی ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے عذاب دکھایا گیا ہے، اس درخت سے بھی زیادہ قریب کر کے۔"

اللہ تعالیٰ نے فدیہ لے کر قیدیوں کو آزاد کرنے کے متعلق یہ آیات نازل فرمائی تھیں:

﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ، لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴾

[1]تاريخ الطبري:2/294-

"کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں یہاں تک کہ وہ زمین پر خوب خونریزی کرلے۔ تم سامانِ دنیا کا ارادہ کرتے ہو اور اللہ آخرت کا ارادہ کرتا ہے۔ اور اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے (ایک بات) پہلے لکھی ہوئی نہ ہوتی تو تمھیں اس کے بدلے میں جو تم نے لیا، بہت بڑا عذاب پہنچتا۔" [1]

یوں قرآنِ مجید نے اس سلسلے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی تائید کی۔ بدر کے قیدیوں کے متعلق تو ان کی یہ رائے تھی کہ انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، تاہم بدر کے ایک اسیر سردار سہیل بن عمرو کے بارے میں بھی ان کا مشورہ یہ تھا کہ اس کے سامنے کے دانت نکال دیے جائیں تاکہ جب بھی بولے، زبان پھسل جائے۔ یوں وہ کبھی ایسی تقریر نہیں کرپائے گا جسے مسلمان ناپسند کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں۔ میں اس کا مثلہ نہیں کروں گا ورنہ اللہ میرا بھی مثلہ کرے گا، ہر چند میں نبی ہی ہوں۔ آپ نے مزید فرمایا کہ عین ممکن ہے، کبھی وہ ایسی بھی تقریر کرے جو آپ کو ناگوار نہ گزرے۔

آپ کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔ وفاتِ نبوی کے بعد جب اہل مکہ نے جادۂ اسلام سے انحراف کرنے کا ارادہ کرلیا اور حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ جو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مکہ کے والی تھے، وہ ان کے ڈر کے مارے چھپ گئے تو حضرت سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اہل مکہ سے خطاب کیا۔ حمد و ثنا کے بعد انھوں نے وفاتِ نبوی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اسلام کمزور نہیں پڑے گا۔ جس آدمی کے متعلق ہمیں شک گزرا کہ وہ اسلام سے منحرف ہونے کے لیے پَر تول رہا ہے، ہم اس کی گردن مار ڈالیں گے۔

[1]الأنفال8: 67- 68-

یوں جو افراد مکہ میں ارتداد کا فتنہ برپا کرنا چاہتے تھے، وہ اپنے ارادے سے باز آگئے۔ حضرت سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کی یہی وہ تقریر تھی جس کا ذکر نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیش گوئی میں کیا تھا۔[1]

خواتین سے بیعت لینے کا مرحلہ آیا تو نبی کریم نے اِس سلسلے میں معاونت کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا۔ چند خواتین بیعت کرنے کے لیے خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئیں۔ اُنھی میں ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہ بھی تھی جو بھیس بدل کر آئی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے بیعت لیتے ہوئے فرمایا: "مجھ سے اِس امر کی بیعت کریے کہ آپ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی۔" ہند بنت عتبہ کی شوخیِ طبع معلوم ہے۔ اس نے تنک کر کہا:

"واللہ! آپ ہم سے ان باتوں کی بیعت لے رہے ہیں جن کی بیعت آپ نے مردوں سے نہیں لی۔" آپ نے مزید فرمایا: "اور اِس امر کی بھی بیعت کیجیے کہ آپ چوری چکاری نہیں کریں گی۔"

ہند بنت عتبہ نے کہا: "واللہ! میں تو گاہے گاہے ابوسفیان کا کچھ روپیہ اڑاتی رہی ہوں۔ اب یہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ میرے لیے حلال تھا یا نہیں۔" ہند کے شوہر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ بھی موقع پر موجود تھے۔ وہ ہند کی باتیں سن رہے تھے۔ انھوں نے ہند سے کہا: "آج سے پہلے میرا جتنا روپیہ تم نے اڑایا ہے وہ میں تمھیں معاف کرتا ہوں۔"

[1]الكامل لابن الأثير: 2،253,252۔

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ جان کر قدرے حیرت ہوئی کہ جن خواتین سے وہ بیعت لے رہے ہیں، انھی میں ہند بنت عتبہ بھی شامل ہے اور وہی ہر مرتبہ بول اٹھتی ہے۔ آپ نے فرمایا: "تو کیا تم ہند بنت عتبہ ہو؟" وہ بولی: "میں ہند بنت عتبہ ہوں۔ ماضی میں جو ہوا سو ہوا۔ اس کے متعلق آپ مجھے معاف کر دیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔"

آپ نے مزید فرمایا کہ اس بات کی بھی بیعت کیجیے کہ آپ زنا نہیں کریں گی۔ ہند بنت عتبہ نے کہا: "اے اللہ کے رسول! آزاد عورت بھی کہیں زنا کرتی ہے؟!" آپ نے فرمایا: "اور اِس امر کی بھی بیعت کریے کہ آپ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔" ہند بنت عتبہ کہنے لگی: "اولاد جب چھوٹی تھی، ہم نے اسے پالا پوسا۔ بڑی ہوئی تو آپ نے یومِ بدر کو اس کا کام تمام کر ڈالا۔"

ہند کی اس بات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھلکھلا کر ہنس دیے۔ آپ نے مزید فرمایا: "اور اِس امر کی بھی بیعت کریے کہ آپ بہتان نہیں باندھیں گی۔" ہند بنت عتبہ نے کہا: "بہتان باندھنا تو واللہ بہت بُری بات ہے۔" آپ نے مزید فرمایا: "اِس کی بھی بیعت کر لیجیے کہ آپ امر جائز میں میری مخالفت نہیں کریں گی۔" وہ بولی: "امر جائز میں آپ کی نافرمانی کرنے کا ارادہ ہوتا تو آپ کی خدمت میں آتی ہی کیوں!" بیعت کی کارروائی پوری ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کرنے والی خواتین کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔[1]

[1]تاريخ الطبري:3،121۔

اکثر ایسا ہوتا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو جو امر اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بہتر معلوم ہوتا، حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتے۔ آپ گاہے ان کی بات تسلیم کرتے اور اس امر کا نفاذ کر ڈالتے اور گاہے مسترد کر دیتے۔ ایک مرتبہ انھوں نے خدمت نبوی میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اپنی ازواج کو پردہ کرایا کیجیے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بقول آپ نے ان کا یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ ازواج مطہرات رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے مدینہ کے باہر کھلی جگہ جایا کرتی تھیں۔

ایک رات حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا قضائے حاجت کے لیے گھر سے نکلیں۔ وہ طویل القامت خاتون تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ معمول کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی بولے: "سودہ! ہم نے آپ کو پہچان لیا۔" [1]

اِس پر اللہ تعالیٰ نے آیت حجاب نازل فرمائی۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خدمت نبوی میں عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! اگر آپ ازواج مطہرات کو پردے میں رکھیں تو کیا یہ اچھا نہیں ہو گا! کیونکہ نیک و بد ہر طرح کے افراد کو ان سے بات چیت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس پر آیت حجاب نازل ہوئی۔[2]

حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: "عمر نے ازواجِ نبوی کو حکم دیا کہ وہ پردے میں رہا کریں۔ ام المومنین زینب رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا: "ابن خطاب! تم ہم پر حکم چلاتے ہو؟! ہم پر!! جن کے گھروں میں وحی اترتی ہے؟!

[1]صحيح البخاري، حديث: 146- [2] صحيح البخاري، حديث: 402-

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ﴾ "اور جب تم ان (ازواج مطہرات) سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔" [1]

رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی مرا تو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ تشریف لایئے اور ابن ابی کی نماز جنازہ پڑھا دیجیے۔ آپ تشریف لے گئے اور نمازِ جنازہ کے لیے کھڑے ہی ہوئے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور روبرو آکر عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! کیا آپ اللہ کے دشمن عبد اللہ بن ابی کے لیے دعائے مغفرت کریں گے جس نے فلاں روز فلاں گھٹیا بات کہی تھی اور فلاں دن فلاں بکواس کی تھی!" وہ عبد اللہ بن ابی کی زبان درازیاں گنواتے رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے مسکراتے رہے۔ انھوں نے باصرار کہا تو آپ نے فرمایا: "عمر! پیچھے ہٹ جایئے۔ مجھے دو باتوں کا اختیار دیا گیا ہے۔ اور میں نے ان میں سے ایک بات اختیار کرلی ہے۔ مجھ سے فرمایا گیا ہے:

﴿اسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ﴾ "تم ان (منافقین) کے لیے مغفرت کی دعا کرو یا ان کے لیے مغفرت کی دعا نہ کرو۔ اگر تم ان کے لیے ستر مرتبہ مغفرت کی دعا کروگے تو بھی اللہ کبھی ان کی مغفرت نہیں کرے گا۔" [2]

[1]الأحزاب 53:33- [2] التوبة 80:9-

اگر مجھے پتہ ہوتا کہ میں ستر سے زائد مرتبہ دعائے مغفرت کروں گا تو ان کی مغفرت کر دی جائے گی تو میں ان کے لیے ستر سے بھی زائد مرتبہ دعائے مغفرت کرتا۔" پھر آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی، جنازے کے ہمراہ گئے اور تدفین تک وہیں ٹھہرے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ مجھے خود پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو اپنی جراَتِ کلام پر بڑی حیرت ہوئی۔ بعد ازاں تھوڑے ہی عرصے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ﴾ "ان (منافقین) میں سے جو بھی مر جائے، تم کبھی اس کی نماز جنازہ مت پڑھنا نہ اس کی قبر پر ٹھہرنا۔" [1] چنانچہ ابن ابی کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو کسی منافق کی نمازِ جنازہ پڑھی نہ اس کی قبر پر ٹھہرے۔ یہ تھے

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جن کے متعلق عہدِ نبوی کی ایک خاتون نے کہا تھا: "وہ تو گویا رب تعالیٰ کو دونوں آنکھوں سے دیکھتا ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا تھا: "اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان پر حق جاری کر دیا اور اس کے دل میں حق کا القا کر دیا ہے۔" [2]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق یہ بھی فرمایا تھا: "اگلی امتوں میں ایسے افراد ہو گزرے ہیں جنھیں الہام ہوتا تھا۔ میری امت میں اگر ایسا کوئی فرد ہے تو وہ عمر بن خطاب ہے۔" [3]

[1]التوبة 9:84- [2] سنن أبي داود، حديث: 2962- [3] صحيح البخاري، حديث: 3689-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو مسلمانوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو آپ کا خلیفہ منتخب کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفۂ رسول کے معاون و مددگار کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ انھوں نے خود اپنے متعلق بتایا: "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کے خادم کی حیثیت سے رہتا تھا۔

ان کی نرم مزاجی اور رحم دلی کے کیا کہنے! کوئی آدمی اتنا نرم مزاج اور رحمدل نہیں ہو سکتا۔ وہ تو جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اہلِ ایمان کے لیے بڑے ہی مشفق اور نہایت درجہ مہربان تھے۔ میں تو ان کی خدمت میں ننگی تلوار کی طرح رہتا تھا۔ چاہتے تو میان میں ڈال لیتے۔ چاہتے تو چھوڑ دیتے اور تلوار اپنا کام کرتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت عالیہ میں جب تک رہا اِسی حیثیت سے رہا۔ جب آپ نے وفات پائی تو اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ مجھ سے راضی تھے۔ میں اِسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔ بعد ازاں ابو بکر مسلمانوں کے والی بنے۔ وہ جیسے آدمی ہیں، سب کو پتہ ہے۔ نہایت نرم دل، اچھے اور دھیمے مزاج کے۔ میں ان کا بھی خادم اور معاون تھا۔ اپنی سخت گیری کو ان کی نرم مزاجی سے ملاتا۔ ان کی خدمت میں بھی میں ننگی تلوار کی طرح رہتا تھا۔ چاہتے تو میان میں ڈال لیتے۔ چاہتے تو چھوڑ دیتے اور تلوار اپنا کام کرتی۔" [1]

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت بہت مختصر تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی پیش گوئی کی تھی۔ آپ نے ایک دفعہ فرمایا تھا: "میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک ڈول کی مدد سے کنویں میں سے پانی

[1]كتاب الخراج لأبي يوسف، ص: 160-

نکال رہا ہوں۔ میرے بعد ابو بکر آئے اور ناتوانی سے ایک یا دو ڈول پانی نکالا۔ اللہ انھیں معاف فرمائے، پھر عمر بن خطاب آئے تو وہ ڈول بڑی بالٹی میں تبدیل ہو گیا۔ میں نے ایسا باکمال آدمی نہیں دیکھا جس نے ان جیسا حیرت انگیز کام کر دکھایا ہو۔ انھوں نے اتنا پانی کھینچا کہ لوگوں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور اونٹوں کو خوب سیر اب کیا۔" [1]

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ صاحبِ فراش ہوئے اور بیماری نے شدت اختیار کی تو انھیں خدشہ لاحق ہوا کہ مبادا وہ مسلمانوں کو نئے خلیفہ کی سرپرستی میں دیے بغیر چھوڑ جائیں۔

انھوں نے جان لیوا بیماری کی مطلق پروانہ کی۔ مسلمانوں کو بلایا، اپنی معزولی کا اعلان کیا اور کہا کہ بارِ خلافت اٹھانے کے لیے کسی اور کو منتخب کر لیجیے۔ انھوں نے فرمایا: ''مجھ پر جو کیفیت (بیماری کی) طاری ہے وہ تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اسی بیماری میں مر جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے عہد وپیمان کو میری فصیلِ بیعت سے آزاد کر دیا اور آپ پر سے میری گرہ کھول ڈالی ہے۔

اس نے آپ کا امر حکومت آپ کو لوٹا دیا ہے، اس لیے جو آدمی آپ کو پسند آئے، اسے اپنا امیر بنا لیجیے۔'' لوگ گئے۔ مشاورت کی۔ جستجو کی لیکن کسی ایک پر اتفاق نہ کر پائے۔ خلیفۂ رسول کی خدمت میں واپس آئے اور عرض کیا کہ آپ ہی نئے خلیفہ کا انتخاب کر دیجیے۔ فرمایا: ''بہت اچھا، مجھے تھوڑی مہلت دیجیے تاکہ میں دیکھوں کہ اللہ کی مرضی کیا ہے، دین کے لیے کیا بہتر اور بندگانِ خدا کے لیے کیا سود مند ہے۔'' حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا۔ وہ تشریف لائے تو فرمایا: ''عمر بن خطاب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟''

[1]صحيح البخاري، حديث: 3682-3664-

وہ کہنے لگے: ''آپ مجھ سے جس امر کے متعلق پوچھ رہے ہیں اسے آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔'' فرمایا: ''پھر بھی، کچھ تو کہیے۔'' وہ بولے: ''آپ انھیں جیسا سمجھتے ہیں وہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہیں۔''

پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا۔ وہ تشریف لائے تو ان سے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے کہا: ''جہاں تک میں جانتا ہوں، ان کا باطن ان کے ظاہر سے بہتر ہے اور ہم میں ان کی سی قابلیت کا کوئی آدمی نہیں۔''

فرمایا: ''اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ اگر میں عمر کو نامزد نہ کروں تو آپ ہی کا انتخاب کروں۔'' ان کے بعد آپ نے کبار صحابہ میں سے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ اور حضرت اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ کی رائے لی۔ حضرت اُسید رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ کے بعد وہی سب سے بہتر نظر آتے ہیں۔'' کافی مشاورت کر چکے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور حسبِ ذیل تحریر لکھوائی:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ تحریر ابو بکر بن ابی قحافہ نے اس وقت لکھوائی جبکہ وہ دنیا سے رخصت ہو کر آخرت کے سفر پر روانہ ہونے والا ہے۔ ایسے وقت جب کافر ایمان لے آتا ہے، فاجر کو یقین آ جاتا اور جھوٹا سچ بولنے لگتا ہے۔ میرے بعد جو آدمی خلیفہ ہو گا، اس کا نام ہے...'' املا کراتے کراتے یہاں پہنچے تو آپ کو غش آ گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا نام لکھ دیا۔ ہوش میں آئے تو فرمایا: ''ذرا پڑھ کر سنائیے، کیا لکھا ہے آپ نے۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام تحریر پڑھ کر سنائی۔ آخر میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا نام بھی پڑھا۔ خلیفۂ رسول نے اُن کا نام سن کر بے اختیار اللہ اکبر کہا اور فرمایا: ''شاید آپ کو یہ خدشہ ہوا تھا کہ غشی ہی کے عالم میں میری روح پرواز کر جائے گی اور خلیفہ کے متعلق لوگوں میں اختلاف پڑ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔

آپ نے بالکل درست لکھا۔" یہ کہہ کر تحریر خلافت کا اختتامیہ لکھوایا: "سونئے خلیفہ کی بات سننا اور اس کا کہا ماننا۔ میں نے اللہ سے، اس کے رسول سے، اس کے دین سے، تم سے اور اپنے آپ سے بھلائی کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

نیا خلیفہ اگر عدل و انصاف سے کام لیتا ہے تو اس کے متعلق میرا یہی حسنِ ظن ہے۔ میں اسے ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ اگر وہ بدل جاتا ہے تو ہر آدمی وہی کچھ پائے گا جو اس نے کمایا۔ میں نے تو بھلائی ہی کا ارادہ کیا ہے۔ غیب کا علم مجھے نہیں۔

﴿ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ﴾

"اور جنھوں نے ظلم کیا وہ عنقریب جان لیں گے کہ وہ لوٹنے کی کیسی (خوفناک) جگہ لوٹتے ہیں۔" [1]

تحریر مکمل ہوئی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خلیفۂ رسول کے حکم سے تحریر کو مہر بند کیا اور اسے ہاتھ میں لیے باہر تشریف لائے۔ باہر آتے ہی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، حضرت اُسید بن حُضیر رضی اللہ عنہ اور حضرت اُسید بن سعید قرظی رضی اللہ عنہ بھی اُن کے ہمراہ ہو لیے۔ تمام

[1]الشعرآء 227:26۔

لوگ بڑی بے چینی سے ان کے منتظر تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کے درمیان پہنچے تو کہا: "اس مہر بند تحریر میں جن صاحب کا نام لکھا ہے، کیا آپ سب ان کی بیعت کریں گے؟" لوگوں نے بیک زبان کہا: "جی ہاں۔" اِس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: "وہ صاحب عمر بن خطاب ہیں۔" سب لوگوں نے سرِ تسلیم خم کیا اور ہنسی خوشی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بیعت نئے خلیفہ کے طور پر کی۔

خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

بیعت مسجدِ نبوی میں انجام پائی تھی۔ تمام مسلمانوں سے بیعت لینے کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ منبر نبوی پر جلوہ افروز ہوئے۔ حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد فرمایا: "ایمان والو! میں تین دعائیں کرتا ہوں، آپ آمین کہنا۔ "اے اللہ! میں کمزور ہوں۔ مجھے طاقتور کر دے۔ بارِ الٰہا! میں سخت ہوں۔ مجھے نرم کر دے۔ خدایا! میں بخیل ہوں۔ مجھے سخی کر دے۔" [1]

پھر فرمایا: "اگر مجھے پتہ ہوتا کہ کوئی اور بارِ خلافت اٹھانے کے لیے مجھ سے زیادہ قوی ہے تو والی بننے کے مقابلے میں گردن کٹوانی مجھے زیادہ بھلی معلوم ہوتی۔"

مزید فرمایا: "میرے صاحب کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو مجھ سے اور مجھ کو آپ سے آزما لیا ہے۔ اِس لیے بخدا! ایسا ہرگز نہیں ہو گا کہ آپ کا کوئی معاملہ میرے سامنے آئے اور میرے علاوہ اسے کوئی اور ہاتھ میں لے۔ اور ایسا بھی نہیں ہو گا کہ کوئی معاملہ میرے سامنے پیش نہ ہو تو میں اس کے متعلق سچے اور

[1]طبقات لابن سعد:3،197-

ایماندار افراد کی بات پر یقین نہ کروں۔ اگر لوگ اچھے طور اطوار اختیار کریں گے تو میں بھی ان سے اچھابرتاؤ کروں گا لیکن اگر وہ برائی پر اتر آئیں گے تو میں انھیں نشانِ عبرت بناڈالوں گا۔" [1]

بعد ازاں آپ کو پتہ چلا کہ لوگ آپ کی تقریر کے باعث سخت خائف ہیں۔ اور تو اور انھوں نے گھروں کے آنگن میں معمول کی مجلس آرائیاں بھی ترک کرڈالی ہیں۔ آپ نے فوراً منادی کرادی کہ سب لوگ مسجد میں اکٹھے ہو جائیں۔ تمام لوگ مسجد میں آگئے تو آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ حمد و ثنااور درود و سلام کے بعد فرمایا:

"مجھے پتہ چلاہے کہ لوگ میری شدت سے خائف ہیں۔ لوگو! مجھے آپ کے معاملات کا والی بنایا گیا ہے۔ آپ کو یہ جان لیناچاہیے کہ میری شدت نرم پڑ چکی ہے۔ ہاں! مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کرنے والوں کے خلاف میری شدت حرکت میں آئے گی۔ جو لوگ امن و سلامتی کے خوگر، متدین و متشرع اور اعتدال پسند ہیں، ان کے لیے میں اس سے کہیں زیادہ نرم ہوں جتنا وہ ایک دوسرے کے لیے نرم ہیں۔ میں کسی کو کسی پر ظلم وزیادتی نہیں کرنے دوں گا بلکہ ظالم کو زمین پر گراؤں گا اور اس کے جبڑے پر پاؤں رکھ کر اس سے حق منواؤں گا۔ اس کے مقابلے میں جو لوگ شریف الطبع، نیک نہاد، سفید پوش اور روکھی سوکھی پر گزارہ کرنے والے ہیں، ان کے روبرو میں اپنار خسار زمین پر رکھوں گا۔

"لوگو! میرے ذمے آپ کے چند حقوق ہیں جن کا میں ذکر کرتا ہوں۔ ان کی ادائیگی میں کوتاہی پر آپ میرا مواخذہ کرسکتے ہیں۔ میں آپ کا خراج اور آپ

[1]طبقات ابن سعد: 1،196-

کے اموال غنیمت حسبِ ضرورت خرچ کروں گا۔ آپ کے وظائف اور آپ کی تنخواہوں میں ان شاء اللہ تعالیٰ اضافہ کروں گا۔ ملک کی سرحدوں کو محفوظ بناؤں گا اور انھیں مستحکم کروں گا۔ جب آپ فوجی مہمات پر جایا کریں گے تو آپ کی واپسی تک باپ بن کر آپ کے اہل وعیال کی نگہداشت کیا کروں گا۔" [1]

یوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھی چند باتوں میں اپنادستور خلافت بیان کر دیا۔ اس دستور کی تشکیل کے سلسلے میں انھوں نے براہِ راست کتاب اللہ سے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلیفۂ اول کے فیضِ صحبت سے استفادہ کیا تھا۔ اکیسویں صدی کی ترقی یافتہ اور مہذب اقوام جو انسانی حقوق کے تحفظ کا دعویٰ رکھتی ہیں، آج بھی جبکہ دنیا اِس قدر ترقی کر چکی ہے اور کاروانِ علم و عقل منزلوں آگے نکل چکا ہے، انسانی حقوق کی پاسداری اور احترام آدمیت کا وہ لائحہ عمل پیش نہیں کر سکیں جسے خلیفۂ ثانی نے آج سے چودہ سوبرس پیشتر نہ صرف تشکیل دیا تھا بلکہ اس پر عمل بھی کر دکھایا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے روبرو جو حلف اٹھایا تھا، اسے پورا کرنا اور خود پر جو ذمے داریاں عائد کی تھیں، ان سے عہدہ بر آ ہونا بڑے آدمیوں کا کام ہے۔ وہی افراد جنھیں اللہ تعالیٰ بدنی قوت کے ساتھ ساتھ علم و حکمت کی روحانی طاقت بھی عطا کرتا اور ان کے دلوں کو ایمان کی روشنی سے منور کرتا ہے۔ [1]
كتاب الخراج لأبي يوسف، ص: 140-

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ان اہل ایمان میں شامل تھے جو پہلے پہل اسلام لائے تھے۔ ایسے باکمال صحابہؓ کرام کو قرآن نے سابقون اولون کا لقب دیا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیوں رقیہ وکلثوم رضی اللہ عنہما کے شوہر نامدار۔ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے ان کے بیٹا ہوا جس کا نام تھا عبد اللہ۔ اسی سے ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہوئی۔ عبد اللہ چھ برس کا تھا کہ ایک روز مرغے نے اس کی آنکھ میں ٹھونگ مار دی۔ وہ سخت بیمار پڑا اور اس زخم کی تاب نہ لا کر وفات پا گیا۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا نے وفات پائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا ان سے بیاہ دی۔ وہ بھی وفات پا گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیسری بیٹی ہوتی تو اسے بھی عثمان ہی سے بیاہ دیتا۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بڑے حیادار آدمی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ سب سے سچے حیادار عثمان ہیں۔[1]

ایک اور موقع پر فرمایا کہ میری امت میں سب سے زیادہ حیادار عثمان ہیں۔[2]

اسی سلسلے کی ایک اور روایت ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمائی۔ انھوں

[1]فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل:1،604، حديث کی سند صحيح ہے۔ جامع الترمذي، حديث: 3790- [2] صحيح الجامع

نے بتایا کہ ایک روز ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ آپ استراحت فرما تھے۔ جلباب (بڑی چادر، چوغہ) کا پلو ایک پنڈلی سے ہٹا ہوا تھا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو اندر آنے کی اجازت دی۔ وہ تشریف لائے۔ جو بات چیت کرنی تھی، کی اور چل دیے۔ بعد ازاں عمر رضی اللہ عنہ آئے اور حاضر خدمت ہونے کی اجازت چاہی۔ آپ نے انھیں بھی اجازت دی۔ وہ آئے۔ کچھ دیر بیٹھے رہے، پھر چل دیے۔ ان کے بعد اتفاق سے عثمان رضی اللہ عنہ آ گئے۔ انھوں نے حاضر خدمت ہونے کی اجازت چاہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ جلباب کا پلو پنڈلی پر ڈال لیا۔ تب انھیں اجازت دی۔ وہ اندر آئے۔ کچھ وقت بیٹھے رہے، پھر چلے گئے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ سے پوچھا: ”یارسول اللہ! آپ ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما کی آمد پر اس طرح اٹھ کر نہیں بیٹھے جس طرح عثمان کی آمد پر اٹھے اور سیدھے ہو کر بیٹھے؟“ فرمایا: ”عثمان بڑا حیادار آدمی ہے۔ اگر میں لیٹے لیٹے اسے اندر آنے کی اجازت دیتا تو وہ شرما جاتا اور جو بات اسے کہنی تھی، وہ کہے بغیر لوٹ جاتا۔ عائشہ! میں ایسے آدمی سے کیوں نہ حیا کروں جس سے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔“ [1]

دورِ پُر فتن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیش گوئیاں کی تھیں ان میں آپ نے بالخصوص حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا تھا کہ وہ فتنوں کے دور میں شاہراہ ہدایت پر گامزن رہیں گے۔ اس ضمن میں ایک روایت حضرت مرہ بن کعب رضی اللہ عنہ کی ہے۔ انھوں نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آئندہ پیش آنے والے

[1]صحيح مسلم، حديث: 2402,2401-

فتنوں کے متعلق بتایا۔ آپ نے بتایا کہ دور پر فتن جلد آنے والا ہے۔ اتنے میں ایک صاحب ادھر سے گزرے جنھوں نے سر اور بدن پر چادر اوڑھ رکھی تھی۔ آپ نے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''یہ صاحب ان دنوں ہدایت پر ہوں گے۔''

میں فوراً اٹھا اور ان کی طرف بڑھا۔ دیکھا تو وہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے۔ میں نے ان کا چہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھیرا اور پوچھا: ''کیا یہ صاحب ان دنوں ہدایت پر ہوں گے؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں۔(یہی)۔'' [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ بھی ہدایت کی تھی کہ فتنوں کے دور میں عثمان بن عفان اور ان کے رفقا کا ساتھ دیجیے گا۔ اس کے متعلق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت آتی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''میرے بعد آپ کو اختلافات اور فتنوں کا سامنا ہو گا۔'' ایک صاحب نے پوچھا کہ یارسول اللہ! تب ہم کس کا ساتھ دیں۔ فرمایا: ''امین اور اس کے رفقا کا ساتھ دیجیے گا۔'' ساتھ ہی آپ نے عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا۔'' [2]

اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ امت مسلمہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بعد سب سے افضل آدمی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی صحابہ کرام نے مراتب کی یہی تقسیم کر رکھی تھی کہ امت محمدیہ میں سب سے افضل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ افضل ترین ہیں۔ اور افضلیت کے لحاظ سے تیسرے درجے پر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فائز ہیں۔ اس سلسلے میں جلیل القدر صحابی ابن صحابی حضرت

[1]جامع الترمذي، حديث: 3704- [2] فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل:1/550، روایت کی سند

عبد اللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کا مصدقہ بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے بعد عمر (رضی اللہ عنہ) اور عمر (رضی اللہ عنہ) کے بعد عثمان (رضی اللہ عنہ) کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے۔ ان تینوں کے بعد ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں مقام و مرتبہ کے لحاظ سے کسی کو کسی سے افضل نہیں کہتے تھے۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے والد کا نام عفان تھا۔ وہ ابو عاص کے فرزند تھے۔ ابو عاص، امیہ کے بیٹے تھے۔ امیہ کا شمار دور جاہلیت کے سر کردہ افراد میں ہوتا تھا۔ وہ اپنے زمانے کا بڑا نامی سردار اور قبیلۂ قریش کی بہت نمایاں شاخ بنو امیہ کا جد امجد تھا۔ بنو امیہ تجارت پیشہ تھے۔ عفان بن ابی عاص بھی بڑی باقاعدگی سے تجارتی سفر پر جایا کرتے اور کثیر منافع کما کر لایا کرتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی اکثر و بیشتر ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ ان کے ایک سفر کی روداد تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ اس سفر میں انھیں جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دور جاہلیت میں ایک مرتبہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے چچا فاکہ بن مغیرہ، صحابیِ رسول حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے والد عوف بن عبد عوف اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے والد عفان بن ابی عاص یمن کے تجارتی سفر پر روانہ ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی ہمراہ تھے۔ بنو جذیمہ کا ایک تاجر یمن میں وفات پا گیا تھا۔ یہ لوگ واپسی پر اس کا

مال بھی لیتے آئے جو وہاں رہ گیا تھا۔ ارادہ تھا کہ تاجر کا مال وہ اس کے ورثا کے حوالے کریں گے۔ دیارِ بنو جذیمہ میں پہنچے تو ایک آدمی خالد بن ہشام اس مال کا دعویدار ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ مال

[1]صحيح البخاري، حديث: 3698۔

تاجر کے ورثا کو پہنچاتے، خالد بن ہشام آڑے آیا اور مال حاصل کرنا چاہا۔ ان تینوں نے اُسے مال دینے سے انکار کیا تو اس نے چھینا جھپٹی شروع کر دی۔ اس کے ہمراہ اس کی قوم کے کئی اور افراد بھی تھے۔ فاکہ، عوف، عفان اور ان کے ہمراہیوں نے سخت مزاحمت کی۔ خالد بن ہشام کے ساتھیوں نے عوف بن عبد عوف اور فاکہ بن مغیرہ کو جان سے مار ڈالا۔ عفان، عثمان اور عبدالرحمن مال لے کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اسلام میں بلند مقام و مرتبہ پانا تھا، اس لیے وہ زندہ سلامت رہے۔ وہ اسلام کے پہلے مہاجر تھے۔ جب مکہ میں مسلمانوں کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تو انھوں نے مع اہل و عیال حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ راہ خدا میں مال خرچ کرنے کی باری آئی تو انھوں نے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ لڑائی کی نوبت آئی تو دشمنان اسلام کے خلاف بڑی بے جگری سے لڑے۔ ان صحابۂ کرام میں شامل تھے جنھیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی گئی تھی۔ ان برگزیدہ افراد میں سے ایک فرد تھے جنھیں تاحیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت خاص کا شرف حاصل رہا۔

وفات نبوی کے بعد خلیفۂ رسول کے مصاحب خاص بنے۔ خلیفۂ رسول تمام اہم معاملات میں ان سے ضرور مشورہ کرتے۔ عنان خلافت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ آئی تو بھی وہ خلیفۂ ثانی کے مشیر ان خاص میں شامل رہے۔ نامساعد حالات میں ہمیشہ مسلمانوں کی مدد کرتے۔

اسلام کے زیر سایہ

عثمان شام کے تجارتی سفر پر تھے۔ ان کے ہمدم دیرینہ طلحہ بن عبید اللہ اس سفر میں

[1]السيرة النبوية لابن بشام:564۔

ان کے ہمراہ تھے۔ سفر سے واپسی پر ان دونوں نے ایک نخلستان میں پڑاؤ کیا تا کہ ذرا ستا کر تازہ دم ہو جائیں۔ نخلستان کے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں انھیں نیند آنے لگی۔ دفعتاً ہاتف غیبی کی آواز آئی: ''ارے سونے والو! جاگو! مکہ میں محمد ظاہر ہو گئے۔''

وہ دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے لیکن ایک دوسرے کو ہاتف غیبی کی آواز کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ ہر ایک کو یہی خیال آیا کہ وہ آواز شاید اسی نے سنی ہے۔ دوسرے کو وہ آواز سنائی نہیں دی۔ ان چند لفظوں نے ان کے دل و دماغ میں بسیرا کر لیا۔ باقی سفر انھی کے متعلق سوچتے ہوئے کٹا۔ وہ دونوں بڑی بے چینی سے منتظر رہے کہ کب مکہ پہنچیں گے اور کب ان الفاظ کی حقیقت معلوم کریں گے۔ مکہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی وہ حرم کعبہ میں پہنچے۔ اہل قریش معمول کی مجالس آراستہ کیے بیٹھے تھے۔ محمد اور ان کی دعوتِ دینی تازہ ترین موضوع بحث تھا۔ اسی موضوع پر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ عثمان اور طلحہ نے بھی وہ تمام باتیں بڑی توجہ سے سماعت کیں۔ ہاتف غیبی کی آواز وہ سن چکے تھے۔ یوں نئے دین کی حقانیت پر وہ گویا پہلے سے ایمان لا چکے تھے۔ عثمان نے طلحہ کا ہاتھ تھاما اور دونوں بیت محمد کی طرف چل دیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسلام کی مقدس تعلیمات سے آگاہ کیا،

قرآنی آیات پڑھ کر سنائیں، اسلام نے انسانوں کو جو حقوق دیے ہیں، ان کے متعلق بتلایا، اللہ تعالیٰ نے اسلام لانے کی بدولت انسانوں کو جو انعام و اکرام دینے کا وعدہ فرمایا ہے، اس کی خبر دی تو وہ دونوں اسلام لے آئے اور تصدیق کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔[1]
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام پر سرداران قریش کو غصہ تو آیا لیکن وہ اُن کا کچھ

[1]الطبقات الکبریٰ لابن سعد:3،55۔

بگاڑ نہیں پائے کیونکہ وہ قریش کی معتبر شاخ بنو امیہ کے قابل فخر فرزند تھے۔ کوئی انھیں ہاتھ بھی لگاتا تو بنو امیہ کی تلواریں طیش میں آجاتیں۔ لیکن خود بنو امیہ کو یہ بات کیونکر ہضم ہوتی کہ ان کے نامی سردار کا بیٹا نئے دین کا لبادہ اوڑھ لے۔ سرداران قریش دارالندوہ میں سر جوڑ کر بیٹھے اور یہ امر متفقہ طور پر طے پایا کہ تمام قبائل کے سردار اپنے اپنے قبیلے کے ان افراد کی خبر لیں اور انھیں سبق سکھائیں جنھوں نے نئے دین کا لبادہ پہنا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے بنو امیہ کے سردار حکم ابن ابی عاص پر دباؤ ڈالا گیا۔ اس نے ان کو پکڑا اور رسیوں میں جکڑ کر کہا کہ آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر نئے دین کے گن گاتے ہو! واللہ! اس وقت تک یہ رسیاں نہیں کھولوں گا جب تک نئے دین کا لبادہ نہیں اتاروگے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی قسم کھا کر کہا: واللہ! یہ دین کبھی نہیں چھوڑوں گا۔[1]

حکم نے دیکھا کہ یہ لڑکا کسی طرح نہیں ٹلتا تو اس نے رسیاں کھول کر انھیں آزاد کر دیا۔ حکم نے تو چھوڑ دیا لیکن دیگر سرداران قریش نے انھیں نہیں چھوڑا۔ وہ انھیں اور اسلام کے دوسرے نام لیواؤں کو برابر ستاتے رہے۔ انھیں طرح طرح کی ایذائیں دیتے رہے۔ ظلم و ستم کا نشانہ بناتے رہے۔ ان کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔ مکہ میں ان کا جینا دوبھر ہو گیا۔ ایک ایک پل گزارنا قیامت معلوم ہوتا تھا۔ تبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ سرزمین حبشہ جہاں ان دنوں ایک انصاف پسند بادشاہ حکومت کرتا تھا، اس کے ملک میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا تھا۔ وقتی طور پر اہل کفر کی ایذارسانیوں سے بچنے کا ایک یہی راستہ تھا جو مسلمانوں نے اپنایا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی زوجہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہ کے

[1]الطبقات الکبریٰ لابن سعد:3،55۔

ہمراہ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ وہ اس دور دراز ملک میں اطمینان و سکون سے رہنے لگے۔ اب وہ بے روک ٹوک اللہ کی عبادت کر سکتے تھے۔ شاہ حبشہ نجاشی نے ان کی میزبانی کے فرائض بڑی تندہی سے انجام دیے۔ اس نے نئے مہمانوں کے آرام و سکون کا ہر طرح خیال رکھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ محترمہ حبشہ میں قیام پذیر رہے تا آنکہ اہل قریش نے یہ جھوٹی خبر پھیلائی کہ انھوں نے اسلام قبول کر کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کا اقرار کر لیا ہے۔ مہاجرین حبشہ یہ خبر پاکر خوشی خوشی اپنے وطن لوٹے۔ یہاں پہنچے تو پتہ چلا کہ اشراف قریش کے قبول اسلام کی خبر جھوٹی تھی۔ بہت پریشان ہوئے کہ اب کیا کریں اور کہاں جائیں۔ مکہ میں رہیں یا واپس چلے جائیں۔ اس پریشانی کا حل جلد نکل آیا۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یثرب کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مل گئی، چنانچہ تمام مسلمان یکے بعد دیگرے یثرب کی طرف ہجرت کر

گئے۔ یثرب میں یہودیوں کا بڑا اثر ورسوخ تھا۔ اوس و خزرج کی باہمی لڑائیوں سے انھوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور خاصی دولت بٹوری تھی۔ میٹھے پانی کا واحد کنواں ایک یہودی کی ملکیت تھا۔ وہ کنویں کا پانی فروخت کیا کرتا اور سینکڑوں روپے نفع کماتا تھا۔

کئی مسلمانوں نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس یہودی کی سنگدلی اور دریدہ دلیری کی شکایت کی اور بتایا کہ وہ مردود چند قطرے پانی کے عوض بیسیوں روپے بٹور لیتا ہے۔ آپ نے تمام مسلمانوں کو بلا بھیجا تاکہ اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کیا جاسکے۔ مشاورت کے بعد یہی طے پایا کہ کنواں خرید لیا جائے۔ مسلمانوں میں جو افراد اصحاب ثروت تھے، آپ نے انھیں اس کی ترغیب دلائی، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہودی سے کنویں کا

سودا کرنے اس کے ہاں گئے۔ یہودی نے کہا کہ تمام کنواں تو میں نہیں بیچنے کا۔ آدھا کنواں لینا ہے تو بات کرو۔ انھوں نے آدھا کنواں بارہ ہزار درہم کو خریدا اور مسلمانوں کے لیے وقف کردیا۔ یہودی سے کہا کہ یا تو اتنا پانی مجھے روزانہ دے دیا کرو جو دو بھری پُری بستیوں کے لیے کافی ہو یا پھر ایک دن کنویں پر میرا حق ہو گا اور ایک دن تمھارا۔

وہ بولا: ایک دن کنویں پر تمھارا حق ہو گا اور ایک دن میرا۔

بات پوری طرح طے پا گئی۔ جس روز کنویں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دن ہوتا، تمام مسلمان اتنا پانی نکال لیتے کہ اگلے دو دن آرام سے گزر جاتے اور مزید پانی کی ضرورت نہ پڑتی۔ یہودی کی باری آتی تو کوئی مسلمان پانی لینے نہ آتا۔ یوں اسے خسارہ ہونے لگا۔ اس نے سوچا تمام کنواں بیچ دینا ہی بہتر ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا: "تم نے تو میرا کنواں خراب کردیا ہے۔ اب باقی آدھا بھی خرید لو۔" انھوں نے مزید آٹھ ہزار درہم دے کر باقی کنواں بھی خرید لیا۔[1]

یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانانِ مدینہ کے لیے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا بھرپور ہمدردانہ کردار سامنے آیا۔ انھیں یقین تھا کہ وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو روپیہ خرچ کریں گے، وہ رائیگاں نہیں جائے گا۔ انھیں اللہ تعالیٰ کے وعدے پر بھروسہ تھا کہ وہ ان کا روپیہ سات سے سات سو گنا کرکے لوٹائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ وَاللهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴾

"ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، اس دانے کی

[1]الاستیعاب فی معرفة الأصحاب، ترجمہ عثمان بن عفان ۔

سی ہے جس میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہے (اجر) بڑھا دیتا ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔" [1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو آپ کی اولین ترجیح یہ تھی کہ مدینہ منورہ میں مسجد تعمیر کی جائے۔ مسلمانوں کو بھی مسجد کی اہمیت کا احساس تھا، چنانچہ زمین خرید کر تعمیر کا آغاز کر دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس تعمیراتی کاموں میں حصہ لیا۔ مہاجرین و انصار نے بھی خوب محنت سے کام کیا۔ مسجد کی تعمیر مکمل ہوئی تو مسلمانوں کی کئی ضروریات پوری ہونے لگیں۔ وہ مسجد میں دین کا علم حاصل کرتے۔ اہم معاملات کے متعلق مسجد ہی میں مشاورت کرتے۔ یہیں سے لشکر روانہ ہوتے۔ دعوت و تبلیغ کے لیے جانے والے افراد بھی یہیں سے رخت سفر باندھتے۔ غرضیکہ مسجد ان کی تمام دینی و سماجی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔

ابتدا میں مسلمانوں کی تعداد چونکہ کم تھی، اس لیے مسجد کا دامن خاصا وسیع معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب لوگوں نے جوق در جوق آکر دین اسلام قبول کیا اور مسلمانوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا تو مسجد تنگیٔ داماں کی شکایت کرنے لگی۔ نمازوں کے اوقات میں بعض دفعہ لوگوں کو نماز کے لیے جگہ بھی نہیں ملتی تھی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس امر کا شدید احساس تھا کہ اب مسجد کی توسیع ہونی چاہیے، چنانچہ آپ نے مسلمانوں سے کہا: "ہماری مسجد کو وسیع کون کرے گا؟"[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور پانچ ستونوں کی وسیع جگہ خرید کر خدمت نبوی

[1]البقرۃ 2: 261- [2] الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب: 106/3-

میں پیش کی۔ یوں مسجد کی وسعت داماں میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا اور تمام مسلمان بآسانی نماز پڑھنے لگے۔ ہجرت مدینہ کے بعد مسجد کی توسیع کا یہ دوسرا افلاحی کام تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں انجام پایا۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور بیعت رضوان

ہجرت کے چھٹے برس ذیقعدہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کرنے کے ارادے سے مکہ روانہ ہوئے۔ مدینہ کے گرد و نواح میں بسنے والے بدوؤں کو بھی آپ نے ہمراہی کی دعوت عام دی۔ خدشہ تھا کہ سرداران قریش سختی سے آڑے آئیں گے اور مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

قربانی کے جانور بھی ساتھ لے گئے۔ اور عمرے کا احرام باندھا تا کہ اہل قریش کو پتہ چلے کہ ان کا ارادہ صرف بیت اللہ کی زیارت کرنے کا ہے۔ چلتے چلتے عسفان میں پہنچے تو بشر بن سفیان کعبی ملے۔ انھوں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! قریش کو جونہی آپ کی آمد کی خبر ملی تھی، وہ شیروں کی کھالیں پہنے، عورتوں اور بچوں کو بھی ہمراہ لیے، ذی طویٰ میں آن بیٹھے تھے۔ انھوں نے عہد کر رکھا تھا کہ آپ کو مکہ میں کبھی داخل نہیں ہونے دیں گے۔ خالد بن ولید کے گھڑ سوار دستے کو انھوں نے کراع غمیم تک بھیج دیا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت آزردہ لہجے میں فرمایا: "افسوس! قریش کو جنگ و جدل نے تباہ و برباد کر ڈالا۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ مجھے عرب کے دوسرے لوگوں سے لڑنے بھڑنے دیتے۔ اگر وہ مجھ پر غالب آجاتے تو قریش کا مقصد پورا ہو جاتا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ مجھے لوگوں پر غالب کر دیتا تو وہ بھی اسلام قبول کر لیتے اور صحیح سلامت بھی رہتے۔ اور اگر وہ اسلام قبول نہ کرتے، تب بھی قوت کے ساتھ تو لڑتے! قریش نے کیا سمجھ رکھا ہے! اللہ کی

قسم! میں ان سے لڑتا رہوں گا تا آنکہ اللہ تعالیٰ اس دین کو غالب فرمادے یا پھر میری گردن تن سے جدا ہو جائے۔" پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر دریافت فرمایا: "کون ہے جو ہمیں اس راستے کے علاوہ کسی اور راستے سے لے جائے جس پر وہ لوگ بیٹھے ہیں؟" قبیلہ اسلم کے ایک آدمی نے کہا: "یارسول اللہ! میں لے جاتا ہوں۔" اس نے انھیں گھاٹیوں کے بیچوں بیچ ایک دشوار گزار راستے پر ڈال دیا۔ وہ راستہ طے پایا تو لوگ تھک کر چور ہو گئے۔ وادی کے آخری کنارے پر پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا: "کہیے کہ ہم اللہ سے مغفرت چاہتے ہیں اور اس کے حضور توبہ کرتے ہیں۔" تمام لوگوں نے حسب ارشاد یہ الفاظ دہرائے تو آپ نے فرمایا: "واللہ! حطہ کے یہی الفاظ ہیں جن کے کہنے کا مطالبہ بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا لیکن وہ انھیں زبان پر نہیں لائے تھے۔"[1] ثنیہ مرار میں پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی اچانک بیٹھ گئی۔ لوگوں نے کہا اونٹنی تو ہٹ کرنے لگی۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ یہ ہٹ نہیں کر رہی۔ نہ اس کی یہ عادت ہے۔ اسے تو فیل (ہاتھی) کے روکنے والے نے روک لیا ہے۔ آج اگر قریش مجھے ایسی معاملت کی طرف بلائیں گے جس میں وہ مجھ سے صلہ رحمی کرنے کو کہیں گے تو میں ان سے وہ معاملت ضرور کروں گا، پھر لوگوں سے فرمایا کہ یہیں پڑاؤ کریے۔ کسی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! وادی بھر میں پڑاؤ کرنے کو پانی نہیں۔ آپ نے اپنے ترکش سے

[1]السيرة النبوية لابن ہشام:361،3، والكامل لابن الأثير:200،2۔

ایک تیر نکالا، ایک صحابی کو دیا۔ وہ تیر لیے ایک تباہ شدہ کنویں میں اترے اور اس میں تیر گاڑ دیا۔ کنویں میں سے بھرپور پانی نکلنے لگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیمہ زن ہو کر ذرا اطمینان لیا تو بدیل بن ورقا خزاعہ کے چند افراد کو ہمراہ لیے حاضر خدمت ہوا۔ انھوں نے آپ سے بات چیت کی اور پوچھا کہ آپ کیوں آئے ہیں۔ آپ نے انھیں بتایا کہ ہم جنگ کرنے نہیں آئے ہم تو بیت اللہ کی زیارت کرنے اور اس کی عزت و حرمت کو خراج تعظیم پیش کرنے آئے ہیں۔ بُدیل بن ورقا اور اس کے ہمراہی واپس گئے۔ انھوں نے قریش سے کہا کہ تم بے صبری سے کام لے رہے ہو۔ محمد لڑائی کرنے نہیں آیا۔ وہ تو بیت اللہ کی زیارت کرنے آیا ہے۔ قریش نے بدیل بن ورقا اور اس کی ساتھیوں کو ڈانٹ پلائی اور کہا کہ اگر وہ لڑائی کرنے نہیں آیا تو بھی وہ مکہ میں زبردستی داخل نہیں ہو پائے گا۔ ورنہ تو عرب کے لوگ ہماری ہنسی اڑائیں گے اور باتیں بنائیں گے۔

ابن ورقا کے بعد قریش کے چند اور سفیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت کرنے آئے۔ ان میں عروہ بن مسعود ثقفی بھی شامل تھا۔ اس نے واپس آکر قریش سے کہا: "قریش کے لوگو! میں نے قیصر و کسریٰ اور نجاشی کی بادشاہت قریب سے دیکھی ہے۔ واللہ! محمد کے اصحاب اس کا جتنا احترام کرتے ہیں میں نے کسی قوم کو اپنے بادشاہ کا اتنا احترام کرتے نہیں دیکھا۔ میں ایسی قوم کا مشاہدہ کر کے آرہا ہوں جو محمد کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑے گی، اس لیے خوب سوچ سمجھ کر اقدام کرنا۔" [1]

اُدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ مکہ جایئے اور

[1]السيرة النبوية لابن ہشام:363،3، والكامل لابن الأثير:202،2۔

اشراف قریش کو بتایئے کہ ہم کاہے کو آئے ہیں۔ انھوں نے عرض کیا یارسول اللہ! خدشہ ہے کہ وہ مجھے گزند پہنچائیں گے کیونکہ مکہ میں بنوکعب (قبیلۂ عمر، بنوعدی بن کعب) کا کوئی سردار نہیں جو وہاں میرا دفاع کرے۔ قریش میری عداوت اور شدت طبع سے واقف ہیں۔ میں آپ کو ایک ایسا آدمی بتاتا ہوں جو اس کام کے لیے زیادہ موزوں رہے گا۔ مکہ میں اس کا اثرورسوخ مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ آدمی ہے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی یہ بات پسند آئی۔ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا۔ وہ تشریف لائے تو آپ نے ان سے کہا کہ ابوسفیان اور اشراف قریش کے ہاں جایئے اور ان سے کہیے کہ ہم جنگ کرنے نہیں آئے۔ ہم تو محض بیت اللہ کی زیارت کرنے اور اس کی حرمت کو خراجِ تعظیم پیش کرنے آئے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حسبِ ارشاد مکہ روانہ ہوئے۔ شہر کے قریب پہنچے تو بنوامیہ کے سردار ابان بن سعید بن عاص سے ملاقات ہوئی۔ اس نے آپ کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ آپ اس کے زیرِ امان مکہ میں داخل ہوئے۔ ابوسفیان اور دیگر اشراف قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام دیا۔ انھوں نے آپ سے کہا کہ اگر آپ بیت اللہ کا طواف کرنا چاہتے ہیں تو کر لیجیے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے میں کعبہ کا طواف نہیں کرنے کا۔ سرداران قریش نے ان سے کہا کہ اب آپ آ ہی گئے ہیں تو چند دن یہیں رکیے، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ چند روز کے لیے مکہ میں ٹھہر گئے۔ ادھر مسلمانوں میں یہ خبر اڑی کہ عثمان کو قتل کر دیا گیا، چنانچہ غم و غصے کی شدید لہر نے انھیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام سے فرمایا: "اب ہم ان سے بدلہ لے کر ہی ٹلیں گے۔" [1]

[1]السيرة النبوية لابن ہشام:3/364، والكامل لابن الأثير:2/203.

آپ نے تمام لوگوں کو اِس امر کی بیعت کے لیے بلایا کہ عثمان کے خون کا بدلہ لیں گے اور مرتے دم تک لڑیں گے۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد بیعت تھی جو بیعت رضوان کہلاتی ہے۔ قرآن مجید میں اس بے مثال بیعت کا نہایت تفصیلی ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بیعت کے تعلق سے مسلمانوں کے جرأت مندانہ کردار کو بے حد سراہا اور صلح حدیبیہ کی حکمت بھی بیان فرمائی۔ ارشاد ہوا:

﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ، وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ، وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَٰذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ، وَأُخْرَى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ، وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوُا الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ، سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ، وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ، هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَنْ يَبْلُغَ مَحِلَّهُ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُؤْمِنَاتٌ لَمْ تَعْلَمُوهُمْ أَنْ تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُمْ مِنْهُمْ مَعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِي رَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴾تستطيع

''البتہ تحقیق اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے، چنانچہ ان کے دلوں میں جو (خلوص) تھا، وہ اس نے جان لیا تو اس نے ان پر طمانیت و تسکین نازل کی اور بدلے میں انھیں قریب کی فتح دی۔ اور بہت سی غنیمتیں بھی (عطا کیں) جو وہ حاصل کریں گے۔ اور اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔ اور اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا ہے کہ تم انھیں حاصل کرو گے، چنانچہ اس نے جلد ہی وہ تمھیں عطا کر دیں اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی ہو جائے اور تاکہ وہ تمھیں صراط مستقیم کی ہدایت دے۔ اور (اللہ نے) دوسری غنیمتوں کا بھی (وعدہ کیا) جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے (مگر) اللہ نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔ اور اگر وہ لوگ، جنھوں نے کفر کیا تم سے لڑتے تو یقیناً وہ پیٹھوں کے بل پھر جاتے، پھر وہ کوئی دوست اور کوئی مددگار نہ پاتے۔ یہ اللہ کا طریقہ ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے اور آپ اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔ اور وہ (اللہ) ہی تو ہے جس نے وادئ مکہ میں ان (کفار) کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیے بعد اس کے کہ اس نے تمھیں ان پر کامیابی دی تھی اور اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے جو تم عمل کرتے ہو۔ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تمھیں مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی اپنی قربان گاہ تک پہنچنے سے روکے رکھا اور اگر (مکہ میں کچھ) مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتے جن (کے ایمان) کو تم نہیں جانتے، (اگر یہ خطرہ نہ ہوتا) کہ تم انھیں روند ڈالو گے، پھر بے خبری میں ان (کے قتل) کی وجہ سے تمھیں تکلیف پہنچتی (تو تمھیں لڑنے کی اجازت دے دی جاتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا) تاکہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اگر وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہوتے تو ان میں جو کافر تھے، ہم انھیں نہایت دردناک عذاب دیتے۔'' [1]

ان آیات کی تفسیر لکھتے ہوئے سید قطب رقمطراز ہیں: ''آج چودہ سو سال بعد میں جب اس مقدس لمحے کا تصور کرتا ہوں، جس وقت اللہ تعالیٰ نے رسول امین کو اہل ایمان کے متعلق بتایا کہ وہ ان سے راضی ہے، وہ ان کے طرز عمل سے خوش ہوا ہے، میں اس بے مثل لحظے کا تصور کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ مسلمانوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی جب یہ مژدۂ جاں فزا ملا ہو گا تو ان کی خوشی اور سرشاری کا کیا ٹھکانہ ہو گا۔ ان باسعادت افراد کو جب یہ آیات پڑھ کر سنائی گئی ہوں گی تو ان میں سے ہر ایک کو اطمینان و سکون کا بے طرح احساس ہوا ہو گا۔ اعتماد و یقین کی لہریں پورے بدن میں دوڑ گئی ہوں گی۔ ایمان و ایقان کی بالیدگی روح کی گہرائیوں تک اتر گئی ہو گی۔''[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیعت رضوان میں شریک نہیں تھے کیونکہ انھیں مکہ میں ٹھہرا لیا گیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر جنگ بندی میں شریک ہوئے تھے، اس لیے انھیں خاطر خواہ انعام ملنا چاہیے تھا۔ ان کے انعام کی صورت یہ ہوئی کہ ان کی طرف سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کی۔ آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر رکھا اور فرمایا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔ آپ اپنے رفقائے کرام کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ آپ نے ہمیشہ ان کی عزت افزائی کی اور انھیں بلند مقام و مرتبہ کا مستحق گردانا۔

بیعت رضوان کے تین برس بعد نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ رومیوں

[1]الفتح 48:18-25- [2] فی ظلال القرآن:504،7-

سے نبرد آزمائی کی تیاری کر یے۔ اس غزوے میں بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فیاضانہ کردار کھل کر سامنے آیا۔ اس دریادلی سے روپیہ خرچ کیا کہ مثال نہیں ملتی۔ مسلمانوں کو دراصل اطلاع ملی تھی کہ نصرانی عرب، شاہِ روم ہرقل کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منصوبہ بنایا کہ وہ تو ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں یا نہیں، ہمی آگے بڑھ کر ان سے دو دو ہاتھ کیے لیتے ہیں۔ سخت گرمی کا موسم تھا۔ ہر سو قحط چھایا تھا۔ لوگ نہایت تنگدستی کا شکار تھے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب ثروت کو توجہ دلائی کہ جنگ کی تیاری کے لیے آپ کو مقدور بھر روپیہ اور ساز و سامان فراہم کرنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلقین پر دولت مند تو رہے ایک طرف، ناداروں نے بھی جو کچھ کمایا تھا، لا کر پیش کر دیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے گھر کا تمام سامان لا کر قدموں میں ڈال دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تین سو اونٹ پالانوں سمیت پیش کر دیے۔ بعد ازاں ہزار اشرفیاں لا کر نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جھولی میں ڈال دیں۔ آپ ان اشرفیوں کو الٹتے پلٹتے اور کہتے جاتے: "آج کے بعد عثمان کا کوئی عمل انھیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔"[1]

وفاتِ نبوی کے بعد بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فیاضی کا یہ طریقہ اپنائے رکھا اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے منصوبوں پر برابر خرچ کرتے رہے۔ اس سلسلے کا ایک یادگار واقعہ یہ ہے کہ خلیفۂ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا۔

قحط کے دوران میں ایک روز لوگ خلیفۂ رسول کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ رسول اللہ کے خلیفہ! آسمان نے بارش نہیں

[1]جامع الترمذي، حديث: 3701۔

برسائی۔ زمین نے سبزہ نہیں اگایا۔ لوگ تو موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایسے میں آپ ہی بتایئے کہ ہم کیا کریں۔ فرمایا: "گھروں کو جاؤ اور صبر و ہمت سے کام لو۔ امید ہے کہ آج شام ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کوئی وسیلہ پیدا کرے گا۔"

آپ کی پیش گوئی پوری ہوئی۔ اسی روز سہ پہر کو خبر ملی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک تجارتی قافلہ شام سے آرہا ہے۔ تجارتی قافلہ مدینہ پہنچا تو لوگ اہل قافلہ کا استقبال کرنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ قافلے میں سو اونٹ شامل تھے جن پر گندم اور روغن زیتون کے علاوہ منقّیٰ بھی لدا ہوا تھا۔ تمام اونٹ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دروازے پر بٹھائے گئے۔ مدینہ کے بڑے بڑے تاجر اونٹوں پر لدا تجارتی سامان خریدنے آ پہنچے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تاجروں سے دریافت کیا کہ آپ مجھے کتنا منافع دیتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ایک روپیہ کے سامان کے عوض ہم آپ کو دو روپیہ دیتے ہیں۔ فرمایا: "مجھے تو اس سے زیادہ کی پیش کش ہوئی ہے۔" تاجروں نے کہا تب ایک روپیہ کے عوض چار روپیہ دیتے ہیں۔ فرمایا: "مجھے تو اس سے بھی زیادہ منافع مل رہا ہے۔" تاجروں نے کہا کہ پانچ روپیہ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے اس سے بھی زیادہ مل رہا ہے۔ تاجروں نے حیران ہو کر پوچھا کہ ابو عمرو! مدینہ کے تمام تاجر یہاں آئے ہیں۔ آپ کو اتنا منافع اور کون دے رہا ہے؟ فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک روپیہ کے بدلے دس روپیہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر ان اونٹوں کا تمام سامان ضرورت مند مسلمانوں کے لیے صدقہ کرتا ہوں۔"[1]

خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو جب تیز دھار زہریلے خنجر کے پے درپے

[1]التمهيد وا لبيان للمالقى، ص: 243۔

وار کر کے شدید زخمی کر دیا گیا تو انھوں نے نیا خلیفہ نامزد کرنے کے بجائے چھ رکنی مجلس شوریٰ تشکیل دے دی اور مجلس شوریٰ کے اراکین سے کہا کہ مشاورت کے بعد خود میں سے کسی ایک کو خلیفہ نامزد کر لیجیے گا۔ مجلس شوری کے چھ اراکین کا انتخاب کرتے وقت انھوں نے اس معیار کو ملحوظ خاطر رکھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان افراد سے تاحیات راضی رہے تھے۔ خلیفۂ ثانی کی انتخاب کردہ مجلس شوری کے ایک رکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ خلیفۂ ثانی نے مرتے وقت مجلس شوریٰ کے اراکین کو ہدایت کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ تین روز میں خلیفہ نامزد کر لیجیے گا۔ اُن کی وفات کے بعد اگلے تین دن اسی مشاورت میں صرف ہوئے اور نئے خلیفہ کے طور پر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ یوں وہ اسلام کے تیسرے خلیفۂ راشد قرار پائے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ”غزوۂ تبوک کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب کو مدینہ منورہ میں خواتین اور بچوں کی نگہبانی پر مامور کیا۔ انھوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ”کیا تمھیں پسند نہیں کہ میرے ساتھ تمھاری حیثیت وہی ہو جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہارون (علیہ السلام) کی تھی۔ اتنی بات البتہ ضرور ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔“[1]

[1]صحيح البخاري، حديث: 4416، و صحيح مسلم، حديث: 2404، واللفظ لمسلم۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ ابوطالب کے بیٹے تھے۔ ابوطالب روپے پیسے کے لحاظ سے متوسط طبقے کے آدمی تھے۔ وہ اپنے یتیم بھتیجے محمد سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اپنے والد عبدالمطلب کی وفات کے بعد قبیلے کے سربراہ وہی تھے اور انھی نے ننھے محمد کی پرورش کا ذمہ لیا تھا۔ محمد کو وہ سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ محمد جب نبی بنے اور دعوت الی اللہ کا آغاز کیا تو ابوطالب نے غیر مشروط طور پر ان کی زبردست حمایت کی۔

ان کا جینا مرنا محمد کے ساتھ تھا۔ چونکہ قبیلے کے سردار تھے، تمام قبیلے کو آمادہ کر لیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جیسی بھی مشکل پیش آئے گی، تمام افراد ان کے دوش بدوش کھڑے رہیں گے اور ان کے ہمراہ تکلیف اٹھائیں گے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا بڑا سہارا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہے، مشرکین مکہ آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے۔ انھوں نے وفات پائی تو مشرکین مکہ کی دیدہ دلیری یہاں تک بڑھی کہ انھوں نے آپ کو جان سے مار ڈالنے کا گھناؤنا منصوبہ بنایا۔ تب آپ نے باذن الٰہی یثرب کی طرف ہجرت کی۔ ابوطالب نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ان کی چھ اولادیں تھیں۔ چار بیٹے، طالب، عقیل، جعفر اور علی۔ دو بیٹیاں، ام ہانی اور جمانہ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام فاطمہ تھا۔ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم بن عبد مناف۔ بڑی نیک اور فاضل خاتون تھیں۔ ننھے محمد کو انھوں نے ماں کا پیار دیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ وہ اسلام لائی تھیں۔ یثرب کی طرف ہجرت بھی کی تھی اور بعد ازاں وہیں وفات پائی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کاشانۂ نبوی میں پرورش پائی تھی۔

ابو طالب کی آمدنی کم تھی اور وہ بوڑھے بھی ہو چکے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابھی بچے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کر کے ان کا کاروبار سنبھال چکے تھے۔ ابو طالب کی کم آمدنی اور کثیر اخراجات کا آپ کو بخوبی اندازہ تھا۔ قریش ان دنوں شدید مالی بحران کا شکار تھے۔ ایک روز آپ اپنے دوسرے چچا عباس بن عبد المطلب کے ہاں گئے جو خاصے مالدار تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ آپ کے بھائی ابو طالب بیچارے نادار ہیں۔ اخراجات بھی ان کے خاصے ہیں۔ حالیہ معاشی بحران نے انھیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ میرے خیال میں ہمیں ان کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ ایسا کرتے ہیں کہ ان کے ایک بیٹے کی پرورش کا ذمہ آپ لے لیجیے۔ اور ایک کو میں اپنی کفالت میں لے لیتا ہوں۔

عباس نے رضامندی کا اظہار کیا تو دونوں چچا بھتیجا ابو طالب کے ہاں گئے اور اُن سے کہا کہ جب تک لوگ حالیہ معاشی بحران سے نہیں نکلتے، آپ کے گھریلو اخراجات ہم اٹھاتے ہیں۔ ہم نے سوچا ہے کہ آپ کا ایک بیٹا عباس کے ہاں پرورش پائے اور ایک میرے ہاں۔ یوں آپ کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ ابو طالب نے کہا کہ عقیل کو اگر تم لوگ میرے لیے چھوڑ دیتے ہو تو پھر جو چاہے سو کرو، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی کی پرورش کا ذمہ اٹھایا اور عباس نے جعفر کو سنبھال لیا۔ یوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کاشانۂ نبوی میں پرورش پاتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پروانۂ رسالت عطا فرمایا تو وہ بھی آپ پر ایمان لے آئے۔[1]

پہلے پہل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق کار یہ تھا کہ نماز کا وقت ہوتا تو آپ مکہ کی گھاٹیوں میں نکل جاتے اور چھپ کر نماز ادا کرتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اکثر آپ کے ہمراہ ہوتے۔

ایک روز ابو طالب نے دونوں کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ انھیں بہت تعجب ہوا۔ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ بھتیجے یہ کیسا مذہب ہے جس کی تم پیروی کرتے ہو، آپ نے جواب دیا: چچا! یہ اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کے رسولوں کا اور ہمارے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کا مذہب ہے۔ مجھے اللہ نے اپنا رسول بنایا ہے۔ میں آپ کی بھلائی سب سے بڑھ کر چاہتا ہوں، اسی لیے آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ راہ ہدایت اپنا لیجیے۔ اس سلسلے میں آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ میری دعوت قبول کریں اور مجھ سے بھرپور تعاون کریں۔ ابو طالب نے کہا کہ بھتیجے! میں اپنے آباء و اجداد کا مذہب نہیں چھوڑ سکتا، ہاں اتنا ضرور کہتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں، کوئی تمھارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: بیٹا! یہ کیسا مذہب ہے جس پر تم عمل پیرا ہو۔ انھوں نے جواب دیا: "ابا! میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آیا ہوں۔ میں ان کے ہمراہ نماز پڑھتا ہوں۔" ابو طالب نے کہا: "ہاں، ٹھیک ہے۔ اس کے ساتھ رہو۔ وہ تمھیں بھلائی ہی کی راہ دکھلائے گا۔"[2]

[1]السيرة النبوية لابن ہشام: 264،1- [2] السيرة النبوية لابن ہشام:265،1، البداية والنهاية لابن كثير:29،3-

یوں حضرت علی رضی اللہ عنہ ان مقدس افراد میں شامل تھے جو پہلے پہل اسلام لائے اور سابقون اولون کے بلند مرتبہ لقب سے پہچانے جاتے تھے۔ اسلام کی دعوت جن مراحل سے گزر کر پروان چڑھی تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہایت قریب سے ان کا مشاہدہ کیا تھا۔ انھوں نے مکہ کے کمزور مسلمانوں کو ظلم و ستم کی چکی میں پستے دیکھا تھا۔ پھر وہ یادگار وقت بھی آیا جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یثرب کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ جس رات اللہ کے نبی کو ہجرت کرنی تھی، مشرکین مکہ نے آپ کے گھر کا گھیراؤ کیا ہوا تھا۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میری سبز حضرمی چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو رہو۔ کوئی تمھارا بال بھی بیکا نہیں کر پائے گا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے حملہ آوروں کی آنکھیں اندھی کر ڈالیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نرغے سے صحیح سلامت نکل آئے اور ہجرت کے راستے پر گامزن ہو گئے۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ صبح سویرے بیدار ہوئے اور دروازے کے باہر ان حملہ آوروں پر تمسخر آمیز نظر ڈالی جو بیچارے ہاتھوں میں ننگی تلواریں لیے سو رہے تھے۔ انھیں بعد ازاں دھوپ کی تمازت نے بیدار کیا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اگلے تین روز مکہ میں گزارے۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مامور کیا تھا کہ لوگوں کی امانتیں واپس کرتے آئیں جو آپ کے گھر میں پڑیں تھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تین ہی دن میں تمام معاملات نمٹائے اور مدینہ روانہ ہو گئے۔

مدینہ منورہ میں آمد

مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے قدم جم گئے اور انھیں اطمینان میسر آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[1]البداية والنهاية لابن كثير: 196،3

نے مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ قائم کیا۔ بعد ازاں مسجد نبوی کی تعمیر عمل میں آئی اور میثاق مدینہ تحریر کیا گیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رشتۂ مواخات حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کے ساتھ قائم ہوا۔[1]

اگلے مرحلے میں غزوات و سرایا کی تحریک کا آغاز ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دلیرانہ کردار نمایاں طور پر سامنے آیا۔ غزوۂ بدر میں فریقین نے ایک دوسرے کو دعوت مبارزت دی تو مسلمانوں کی جانب سے جو تین شہ زور آگے بڑھے ان میں ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے مدمقابل ولید بن عتبہ کو دیکھتے ہی دیکھتے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ غزوۂ بدر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دختر رسول حضرت فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ہو گئی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ان کی تین اولادیں تھیں۔ حضرت حسن، حضرت حسین اور حضرت ام کلثوم۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے چھے ماہ بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی خالق حقیقی سے جا ملیں۔

غزوۂ احد میں مسلمانوں کے علمبردار حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے جام شہادت نوش کیا تو گرتے ہوئے جھنڈے کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تھام لیا۔ مشرکین مکہ کے علمبردار ابوسعد بن ابی طلحہ نے دعوت مبارزت دی تو وہ آگے بڑھے اور مقابلے میں آئے۔ دونوں نے دو دو چار چار

ہاتھ مارے۔ آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک ہاتھ ایسامارا کہ مد مقابل زمین پر جارہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فوراپلٹ آئے اور اس کاکام تمام نہیں کیا۔ کسی نے کہا کہ اس کاکام تمام کرکے ہی آتے۔ انھوں نے جواب دیا: کہ بچارے کی شرمگاہ کھل گئی تھی مجھے اس پر ترس آگیا تھا۔

[1]الکاشف للذہبی:3،218۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار جنگ کے دہکتے شعلوں میں بھی ان اخلاقی اقدار کالحاظ کرتے تھے جو انھیں اسلامی تعلیمات سے حاصل ہوئی تھیں۔ غزوۂ خندق میں جس میں کھل کر لڑائی نہیں ہوئی تھی، اس غزوے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جرأت مندانہ کردار تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف میں لکھا گیا۔

غزوہ خندق میں مسلمانوں نے مدینہ کے دفاع کے لیے اس کے ایک طرف لمبی چوڑی اور خوب گہری خندق نکالی تھی۔ ایک جگہ سے خندق ذرا کم گہری تھی۔ مشرکین مکہ کے چند گھڑ سواروں نے عمرو بن عبد ود کی قیادت میں وہاں سے خندق عبور کرلی۔ دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چند مجاہدین کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ آپ نے عمرو بن عبد ود سے کہا کہ عمرو! تم نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ قریش کا جو بھی آدمی تمھیں دو اچھی باتیں اپنانے کی دعوت دے گا، تم اس کا کہاضرور مانو گے۔

وہ بولا۔ ہاں۔ یہ تو میں نے ضرور کہا تھا۔ فرمایا تو میں تمھیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلاتا ہوں اور اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ وہ بولا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ فرمایا تو پھر سواری سے اترو۔ ذرا دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ ابن عبد ود نے کہا کہ بھتیجے! کیوں؟! واللہ! میں تمھیں مار ڈالنا نہیں چاہتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا لیکن میں تمھیں مار ڈالنا چاہتا ہوں۔ عمرو بن عبد ود کو اس بات پر طیش آگیا۔ اس نے گھوڑے سے اتر کر اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور آگے بڑھا۔ تلواروں کے وار پے بہ پے پڑنے لگے۔ آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک وار ایسا بھرپور کیا کہ ابن عبد ود کا کام تمام ہو گیا۔ ان کے دوسرے گھڑ سواروں نے یہ ہولناک منظر دیکھا تو وہیں سے بھاگ گئے۔[1]

[1]السیرۃ النبویۃ لابن ہشام: 3،241۔

غزوۂ خندق میں مشرکین مکہ اور ان کے حلیف قبائل شکست فاش سے دوچار ہوئے۔ بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں منادی کرادی کہ جو آدمی یہ اعلان سن رہاہے اور وہ مطیع و تابع فرمان ہے، اسے چاہیے کہ نماز عصر دیار بنو قریظہ میں ادا کرے۔ دراصل آپ یہود بنی قریظہ کو ان کی بد عہدی کا مزہ چکھانا چاہتے تھے۔

مسلمانوں نے ارشاد نبوی کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً دیار بنی قریظہ کارخ کیا۔ ہر اول دستے کے سالار حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔ علم نبوی ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ یہود بنو قریظہ کے قلعے کے قریب پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہودیوں کی بد زبانیاں ان کے کانوں میں پڑیں۔ وہیں سے پلٹ آئے۔ راستے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی جو مسلمانوں کے جلو میں دیار بنی قریظہ کی طرف رواں دواں تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر آپ ان خبیثوں کے قریب نہ جائیں تو میں سمجھتا ہوں کوئی مضائقہ نہیں۔ فرمایا کیوں۔ میرا خیال ہے تم نے ان کی بد زبانیاں سن لی ہیں۔ عرض کیا: جی ہاں، اے اللہ کے رسول! فرمایا اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو ایسا کچھ نہ کہتے۔

آپ ان کے قلعے کے قریب گئے تو باآواز بلند کہا: ارے بندروں کے بھائیو! کیا اللہ نے تمھیں ذلیل ورسوا کیا اور تم پر اپنا عذاب نازل کیا؟!" انھوں نے جواب دیا کہ ابوالقاسم! آپ اس امر سے ناواقف تو نہیں۔ مسلمانوں نے پچیس روز تک ان کے قلعوں کا محاصرہ کیے رکھا۔ آخر انھوں نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر ہتھیار ڈال دیے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ دور جاہلیت میں ان کے حلیف تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا

کہ یہود بنی قریظہ میں جتنے مرد لڑائی کے قابل ہیں انھیں قتل کر دیا جائے۔ عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا جائے اور ان کے اموال مسلمانوں میں تقسیم کر دیے جائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فیصلے کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔[1]

صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش مکہ اور مسلمانان مدینہ کے درمیان امن کا جو معاہدہ ہوا تھا، قریش مکہ نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی تو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے قریش کو خط لکھا کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ پر چڑھائی کرنا چاہتے ہیں، اس لیے بچاؤ کا سامان کر لو۔ انھوں نے وہ خط بنی عبد المطلب کی ایک باندی سارہ کے حوالے کیا، اسے اجرت دی اور کہا کہ یہ خط قریش کو پہنچا دو۔ اس نے وہ خط سر کے بالوں میں رکھا اور بالوں کی چوٹی بنا کر نکل کھڑی ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے سے خبر مل گئی کہ حاطب نے قریش کو خط لکھا ہے اور خط پہنچانے والی عورت فلاں جگہ راستے میں ہے۔ آپ نے فوری طور پر حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما کو روانہ کیا اور اُن سے فرمایا: "فلاں جگہ آپ کو ایک عورت ملے گی، اس کے پاس ایک خط ہے جو حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش کو لکھا ہے، وہ خط لے آیئے۔" دونوں حضرات نہایت تیزی سے روانہ ہوئے اور اس عورت کو جالیا۔ اسے سواری سے اتارا اور اس کے سامان کی تلاشی لی۔ کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس عورت سے فرمایا: میں حلفیہ کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں اور آپ کی دی ہوئی

[1]صحيح البخاري، حديث: 3043، مسند أحمد:142/6.

خبر بھی بالکل سچی ہے، اس لیے یا تو تم وہ خط ہمارے حوالے کر دو یا پھر ہم تمھاری جامہ تلاشی لیتے ہیں۔ عورت نے جب یہ دیکھا کہ یہ خط لیے بنا نہیں ٹلیں گے تو اس نے سر کے بال کھولے اور خط نکال کر دے دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ خط لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ خدمت نبوی میں ایسے چاق و چوبند سپاہی کی حیثیت سے رہتے تھے جو سپہ سالار کے احکامات کا منتظر رہتا ہے۔ سپہ سالار جو حکم دے وہ فوراً اس کی تعمیل کے لیے سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں رہنے کا حکم دیا۔ منافقین نے شور مچا دیا کہ علی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بار خاطر ہیں، اسی لیے آپ نے انھیں مدینے میں رہنے دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منافقین کی بکواس سنی تو اسلحہ اٹھایا اور اکیلے ہی نکل کھڑے ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کی جانب عازم سفر تھے اور فی الحال جرف میں پڑاؤ کیے ہوئے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ خدمت نبوی میں پہنچے تو عرض کیا کہ اے اللہ کے نبی! آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ فرمایا: میں

نے تم کو تمھارے اور اپنے اہل خانہ کی حفاظت کے لیے مدینہ منورہ میں رہنے کا حکم دیا تھا۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو مدینے میں رہنا تھا۔ اب میں مدینہ میں رہتا ہوں یا پھر تم۔" پھر فرمایا: کیا تمھیں پسند نہیں کہ میرے ساتھ تمھاری وہی حیثیت ہو جو موسیٰ کے ساتھ ہارون کی تھی۔ اتنی بات البتہ ضرور ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔"[2]

[1]صحيح البخاري، حديث: 6259، والسيرة النبوية لابن بشام: 16،4، والكامل لابن الأثير :2،242- [2] صحيح البخاري، حديث

آپ کی بیان کردہ وجوہات اور اطمینان بخش ارشادات سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بے حد تسلی ہوئی اور وہ مدینہ لوٹ آئے۔ اس موقع پر ان کا مدینہ میں رہنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے متعلق یہ فرمانا کہ اب یا تو میں مدینہ میں رہتا ہوں یا پھر تم، اس امر کا آئینہ دار ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں آپ کے نجی معاملات کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جو مقام و مرتبہ تھا وہ کسی اور کو حاصل نہیں تھا۔

9ھ میں حج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا۔ صحابۂ کرام کی بڑی تعداد ان کے ہمراہ حج کو روانہ ہوئی۔ اُدھر وہ روانہ ہوئے اِدھر سورۂ توبہ نازل ہوئی۔ سورۂ توبہ میں دو چار ایسی اہم باتیں نازل ہوئی تھیں کہ حج کے موقع پر ان کا اعلان کرنا ضروری تھا۔ ان میں سے ایک بات جاری معاہدے کے بر قرار رہنے کے متعلق تھی۔ دستور عرب کے مطابق جاری معاہدے کو بر قرار رکھنے یا اس کے توڑنے کا اعلان سردار قبیلہ یا اس کے خاندان کے کسی فرد کو کرنا ہوتا تھا۔ یوں حضور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس مقصد کے لیے روانہ فرمایا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ہمراہ ابھی ذوالحلیفہ میں تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جا پہنچے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انھیں دیکھتے ہی دریافت فرمایا کہ امیر ہو یا مامور (ماتحت)؟ انھوں نے کہا: مامور (ماتحت) ہی ہوں، چنانچہ یہ دونوں حضرات روانہ ہوئے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ امیر حج کے فرائض انجام رہے اور حضرت علی جا بجا یہ اعلان کرتے پھرے کہ کافر جنت میں نہیں جائے گا۔ آئندہ کوئی مشرک حج نہیں کر پائے گا۔ نہ کوئی برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرے گا۔ جاری معاہدے اپنی مدت پوری کریں گے۔[1]

[1]البداية والنهاية:5،43-

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑی منصف مزاج طبیعت پائی تھی۔ اپنے دور خلافت میں عمرو بن سلمہ کو اصفہان کا وزیر بنایا۔ ایک دفعہ وہ بہت سارا روپیہ، شہد اور گھی کی بھری کئی مشکیں لائے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے عمرو بن سلمہ کو پیغام بھیجا کہ تھوڑا سا شہد اور گھی بھیجو۔ انھوں نے ایک برتن میں شہد اور ایک میں گھی ڈال کر ان کے ہاں بھیج دیا۔ اگلے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وہ روپیہ، گھی اور شہد مسلمانوں میں تقسیم کرنے کے لیے منگایا تو دو مشکیں کم نکلیں۔ عمرو سے پوچھا تو اس نے گول مول جواب دیا۔ آپ نے ذرا سختی سے باز پُرس کی تو اُس نے بتا دیا کہ دونوں مشکوں کا شہد اور گھی آپ کی صاحبزادی کے ہاں بھیجا گیا ہے۔ آپ نے وہ تمام شہد اور گھی صاحبزادی کے ہاں سے واپس منگا لیا۔ ایک تاجر سے فرمایا کہ ذرا آنکیے، کتنے روپیہ کا شہد اور گھی کم ہے۔ تاجر نے آنکا تو تین روپیہ کا شہد اور گھی کم نکلا، چنانچہ پہلے وہ تین روپے صاحبزادی کے ہاں سے منگائے، پھر وہ تمام اشیاء مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔ یہ تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ جو مدرسۂ نبوی کے فیض یافتہ تھے۔ ان کی عدل گستری کا ایک اور واقعہ سنیے جس کے راوی ہیں امام عامر شعبی۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ایک زرہ جنگ صفین کے دن گم ہو گئی تھی جو بعد ازاں انھیں ایک عیسائی کے پاس دکھائی دی۔ آپ اسے ساتھ لیے اپنے مقرر کردہ قاضی شریح کے ہاں گئے اور قاضی صاحب سے کہا کہ یہ زرہ میری ہے۔ عیسائی نے کہا کہ نہیں، یہ زرہ میری ہے۔ قاضی

صاحب نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ثبوت طلب کیا۔ آپ نے کہا کہ ثبوت تو میرے پاس کوئی نہیں۔ قاضی صاحب نے عیسائی کے حق میں فیصلہ دیا اور زرہ اس کے حوالے کر دی۔ وہ زرہ لے کر گیا لیکن تھوڑی دیر میں لوٹ آیا۔ وہ بولا یہ تو انبیا کے سے فیصلے ہیں۔ امیر المومنین مجھے اپنے قاضی کے روبرو لے گئے اور ان کے قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ دیا۔ یہ کہہ کر اس نے کلمہ پڑھا اور مسلمان ہو گیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ یہ امیر المومنین ہی کی زرہ ہے۔ صفین جاتے ہوئے راستے میں ان سے گر پڑی تھی۔ امیر المومنین اس کے قبول اسلام سے بہت خوش ہوئے۔ آپ نے وہ زرہ اسے تحفے میں دے دی اور مزید ایک گھوڑا بھی انعام میں دیا۔[1]

[1]الکامل فی التاریخ لابن الأثیر:3/400۔

بیعت خلافت جس روز خلیفۂ ثالث امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو ظالمانہ طور پر شہید کر دیا گیا، اسی روز بہت سے لوگ جن میں جلیل القدر صحابہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر مہاجرین اور انصار بھی شامل تھے، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ خلیفۂ ثالث کو شہید کر دیا گیا ہے۔ اب ضروری ہے کہ نئے خلیفہ کی بیعت کی جائے۔ اِس لیے نئے خلیفہ کے طور پر ہم آپ کی بیعت کرنے آئے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ مجھے خلیفہ بننے کی کچھ ضرورت نہیں، میرے علاوہ آپ جسے بھی خلافت کے لیے انتخاب کریں گے، مجھے اس کی بیعت کے لیے تیار پائیں گے۔ یہ کہہ کر آپ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما کی طرف دیکھا اور کہا کہ میں آپ دونوں میں سے کسی ایک کی بیعت کرتا ہوں۔ ان دونوں نے کہا: نہیں بلکہ ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ دیگر صحابۂ کرام نے بھی کہا کہ اس وقت آپ سے بڑھ کر خلافت کا حقدار کوئی نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا اصرار دیکھا تو فرمایا: میری بیعت خفیہ طور پر نہیں ہو گی۔ میں مسجد میں جاؤں گا اور علانیہ بیعت لوں گا، چنانچہ تمام لوگ مسجد میں جمع ہوئے۔

حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما بھی مسجد میں آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے ایک مرتبہ پھر کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں تو میں آپ کی بیعت کر لیتا ہوں۔ ان دونوں نے کہا نہیں، ہم آپ ہی کی بیعت کریں گے۔ یوں تمام لوگوں نے بشمول صحابۂ کرام اور مہاجرین و انصار متفقہ طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ اگلے روز جمعے کا دن تھا۔ آپ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر بیٹھے تو ان صحابۂ کرام نے بھی آ کر بیعت کی جو کل بیعت کرنے سے رہ گئے تھے۔[1]

اس موقع پر صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ جب تک تمام ملک سے نمائندہ وفود آ آ کر آپ کی بیعت نہ کر لیں، کسی سے بیعت نہ لیجیے۔ آپ نے جواب دیا کہ بات تو ساری اہل مدینہ کی ہے۔ اہل مدینہ نے بیعت کر لی تو بیعت واقع ہو گئی۔[2]

پھر آپ نے تمام ملک میں اپنے وزرا روانہ کیے۔ اس موقع پر بھی حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ ملک کے حالات بہت خراب ہیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر لوگ غم و غصے سے بھرے ہوئے ہیں، اس لیے آپ فی الحال عثمان (رضی اللہ عنہ) کے وزرا کو برقرار رہنے دیجیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ بھی قبول نہیں کیا۔"[3]

ادھر ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے خلیفہ شہید کی خون آلود قمیص اور ان کی اہلیہ حضرت نائلہ رضی اللہ عنہا کی بریدہ انگلیاں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کے ہاتھ شام بھجوادی تھیں۔ اہل شام جن میں بڑی تعداد صحابہ کرام کی تھی، ان چیزوں کو سامنے رکھے رورہے

[1]البداية والنهاية لابن كثير: 227،4- [2] تاريخ الطبري: 482،2- [3] تاريخ الطبري: 461،5-

تھے۔ انھوں نے شام کے والی نامور صحابیٔ رسول حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے کہہ دیا تھا کہ عثمان (رضی اللہ عنہ) ہمارے خلیفہ تھے۔ ہمیں ان کے خون کا بدلہ لینا ہے۔ اگر آپ ہمیں بدلہ دلواسکتے ہیں تو ٹھیک ورنہ ہم کسی اور کو امیر بنالیتے ہیں۔[1]

ان حالات میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کا مطالبہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ جب تک قاتلین عثمان ہمارے حوالے نہیں کیے جاتے، ہم علی بن ابی طالب کی بیعت نہیں کریں گے۔ مدینہ میں ہی حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کردیا تھا کہ جتنی جلدی ہوسکے، قاتلین عثمان سے قصاص لیجیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ عذر پیش کیا تھا کہ میں ایسے افراد کو کیونکر کٹہرے میں کھڑا کروں جو میرے قابو میں نہیں۔ ذرا حالات تو قابو میں آنے دیجیے۔ ورنہ ہم خانہ جنگی کا شکار ہوجائیں گے۔[2]

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں بصرہ جاتا ہوں اور وہاں سے ایک لشکر لے آتا ہوں، پھر ہم قاتلین عثمان سے بدلہ لے پائیں گے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی کہا کہ میں کوفہ جاکر ایک لشکر لے آتا ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر بھی راضی نہیں ہوئے۔[3]

دراصل قاتلین عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل تھے اور ان کا بڑا اثر ورسوخ تھا۔ آپ کو خدشہ تھا کہ ان پر فرداً فرداً ہاتھ ڈالا گیا تو ان کے لیے ان کے تمام اہل قبیلہ بھی بھڑک اٹھیں گے اور لڑائی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مکہ سے مدینہ واپس آرہی تھیں کہ راستے میں شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کی خبر ملی۔ وہیں سے واپس پلٹ گئیں اور مکہ پہنچ کر اعلان کردیا کہ عثمان کے

[1]الأنساب:418،4- [2] تاريخ الطبري:460،5- [3] تاريخ الطبري:361،5-

خون کا بدلہ لیا جائے گا۔ ادھر حضرت طلحہ بن عبیداللہ اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اجازت مانگ لی تھی کہ ہمیں مدینہ سے جانے دیجیے، پھر ہم جانیں اور ہمارا کام۔ آپ نے انھیں اجازت دے دی۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وزراملک کے مختلف شہروں میں پہنچ رہے تھے۔ شام کی وزارت آپ نے حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دینی چاہی لیکن انھوں نے معذرت کرلی اور کہا کہ مجھ سے یہ بار گراں نہیں اٹھایا جائے گا۔ وہ اسی رات مدینہ سے روانہ ہوکر مکہ پہنچ گئے۔"[2]

ان کے انکار پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کو شام کی وزارت پر روانہ کیا۔ وہ شام کے قریب پہنچے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھڑسوار دستے نے استقبال کیا۔ اس کے سالار نے حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ عثمان (رضی اللہ عنہ) کے وزیر

ہیں تو خوش آمدید۔ کسی اور کی طرف سے آئے ہیں تو بہتر ہو گا کہ یہیں سے پلٹ جائیے۔ حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ خاموشی سے پلٹ آئے۔[3]

دوسری طرف حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما مدینہ سے نکل کر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں مکہ تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید ہوئے چار مہینے گزر چکے تھے لیکن ان کے قاتل ابھی تک دندناتے پھرتے تھے۔ حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے طے کیا کہ بصرہ چل کر قاتلین عثمان کو ڈھونڈنا اور ان سے انتقام لینا چاہیے۔ ادھر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مرکز خلافت کوفہ منتقل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا اور وہ روانہ ہونے والے تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ان کے اس اقدام کی بھی مخالفت کی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ ان کے خیر خواہ کوفہ وبصرہ میں ہیں،

[1]تاريخ الطبري: 5،368- [2] سير أعلام النبلاء: 3،224- [3] تاريخ الطبري: 5،466-

اس لیے انھیں وہیں جاکر تمام معاملات نمٹانے چاہئیں۔[1]

اسی اثنا میں انھیں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ اور حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کی بصرہ روانگی کی اطلاع ملی، چنانچہ انھوں نے پہلے بصرہ جانے اور ان محترم حضرات سے معاملات طے کرنے کا منصوبہ بنایا۔ صحابہ کرام میں بڑی تعداد ایسے افراد کی بھی تھی جنھیں ان تمام معاملات سے کچھ سروکار نہیں تھا۔ فتنوں سے دامن بچا کر اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے تھے۔ ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت اسامہ بن زید، حضرت محمد بن مسلمہ، حضرت سلمہ بن اکوع، حضرت عمران بن حصین، حضرت سعید بن عاص، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص، حضرت صہیب بن سنان رومی، حضرت ابوایوب انصاری، حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبد اللہ بن سعد بن ابی سرحy نمایاں طور پر شامل تھے۔ معاملات نہایت مشتبہ تھے۔ یوں ہر کوئی اپنے اپنے اجتہاد پر کاربند تھا۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرات طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہما کے لشکروں نے بصرہ پہنچ کر قاتلین عثمان کے ایک سرغنہ حکیم بن جبلہ اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر ڈالا تھا۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اپنے لشکر سمیت بصرہ پہنچ چکے تھے۔ فریقین اس امر پر متفق تھے کہ قاتلین عثمان سے انتقام لینا چاہیے تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ حالات ذرا قابو میں آئیں تو یہ کام کیا جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرات طلحہ وزبیر رضی اللہ عنہما کے خیال میں یہ کام اولین فرصت میں کرنا چاہیے تھا اور خلیفہ اگر اس پر قادر نہیں تھا تو وہ خود یہ کام کر رہے تھے۔ حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ اِس کوشش میں مصروف تھے کہ فریقین میں صلح ہو جائے۔ اُن کی کوشش بار آور ثابت ہوئی تھی اور فریقین صلح پر راضی تھے کہ سبائیوں نے

[1]الثقات لابن حبان:2،284-

جنگ کی آگ بھڑکا دی، جس کے نتیجے میں جنگ جمل کا افسوسناک سانحہ پیش آیا۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سمیت بیس ہزار مسلمان اس جنگ کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جنگ کے اختتام پر تمام اہل بصرہ نے حضرت علی ابن ابی طالب کی بیعت کر لی اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مدینہ واپس تشریف لے آئیں۔

اب حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اہل شام کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو ان کے ہاں روانہ کیا۔ انھوں نے آکر بتایا کہ اہل شام کہتے ہیں پہلے عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتل ہمارے حوالے کیجیے، پھر ہم آپ کی بیعت کریں گے۔ یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پیش قدمی کی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اس مرتبہ بھی والد کی مخالفت کی کہ آپ کو اہل شام سے لڑائی نہیں کرنی چاہیے۔ بہت سے مسلمانوں کا خون بہہ جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کا مشورہ نہیں مانا اور پیش قدمی کر کے صفین میں جا پڑاؤ کیا۔[1]

حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما قاتلین عثمان سے انتقام لینے کے سلسلے میں نہایت سنجیدہ، پر عزم اور غایت درجہ مخلص تھے۔ انھوں نے اپنے طور پر مصر میں دندناتے پھرتے ان فتنہ پردازوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا تھا جنھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر دھاوا بولنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی کا پتہ چلا تو انھوں نے شام کے عمائدین سے مشاورت کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ قاتلین عثمان (رضی اللہ عنہ) کی حوالگی یا پھر جنگ۔ چنانچہ صفین میں خونریز لڑائی ہوئی، جس کے نتیجے میں ستر ہزار مسلمان مارے گئے۔ لڑائی کے تیسرے روز فریقین کی طرف سے جنگ بندی کی آوازیں اٹھیں۔ یہ طے پایا کہ فریقین کی طرف سے ایک ایک آدمی ثالثی کا کردار ادا کرے گا۔ وہ جو فیصلہ کرے گا

[1]البداية والنهاية:7/240-

اسی پر عمل کیا جائے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا ثالث (حکم) حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بنایا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا نام پیش کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں موجود قاتلین عثمان ان کے اس فیصلے پر بگڑ گئے۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ یونہی جنگ جاری رہے۔ فریقین کی قوت ضائع ہو اور وہ ان سے بدلہ لینے کے لیے ایکا نہ کر پائیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی صلح پر راضی ہیں تو وہ ان کے خلاف ہو گئے اور لشکر سے علیحدگی اختیار کر لی۔ انھی افراد نے بعد ازاں خوارج کا روپ دھارا۔ 17 صفر 37ھ کو فریقین میں معاہدۂ صلح تحریر کیا گیا۔ بعد ازاں حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کے ہمراہ شام واپس چلے گئے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نہروان میں خوارج کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔ بعد ازاں خوارج نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اپنے تین سورما انھوں نے اس مہم کے لیے تیار کیے۔ ان تینوں نے ایک ہی دن فجر کے وقت شام اور کوفہ میں ان تینوں پر حملہ کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر حملہ آور کا وار اوچھا پڑا اور وہ معمولی زخمی ہوئے۔ حملہ آور کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اس روز بیمار تھے۔ گھر سے ہی نہیں نکلے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ کرنے والے کا نام ابن ملجم تھا۔ اس کے وار کاری ثابت ہوئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ زخمی ہو کر بعد ازاں جام شہادت نوش کر گئے۔[1]

یہ 21 رمضان المبارک 40ھ کی صبح کا واقعہ ہے۔[2]

[1]تاريخ الطبري:5/1489- [2] التاريخ الكبير للبخاري:1/99-

قرآنِ مجید میں اوامر واحکامات

منکرات وممنوعات

(منکر)

وہ باتیں جن کو نہ کرنے کا حکم قرآن سے ثابت ہے اور ان کا ارتکاب حرام وممنوع ہے، انھیں قرآنی منکرات ونواہی کہا جاتا ہے، جو درجِ ذیل ہیں: 1- شرک نہ کرو:

1 پارہ 1 {الٓمّٓ} سورۃ البقرہ (آیت:٢٢) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{فَلَا تَجۡعَلُوۡا لِلّٰهِ اَنۡدَادًا وَّاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ}

"پس کسی کو اللہ کا ہمسر (شریک) نہ بناؤ اور تم جانتے تو ہو۔"

اس آیت میں شرک کرنے سے منع کیا گیا ہے، جس کی تفصیل کتاب کے شروع میں گزر چکی ہے۔ غرض کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی عبادت کی دعوت تمام انسانوں کو دی جا رہی ہے۔ فرمایا: جب تمھارا اور کائنات کا خالق اللہ ہے اور تمھاری تمام ضروریات کا مہیا کرنے والا وہی ہے تو پھر تم اسے چھوڑ کر دوسروں کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ دوسروں کو اس کا شریک کیوں ٹھہراتے ہو؟ اگر تم عذابِ الٰہی سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا صرف ایک طریقہ ہے کہ اللہ کو ایک مانو اور صرف اسی کی عبادت کرو، جانتے بوجھتے شرک کا ارتکاب مت کرو۔

2 سورۃ النساء (آیت:٣٦) میں ارشادِ گرامی ہے:

{وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـئًـا}

"اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ۔"

3 سورۃ الکہف (آیت:١١٠) میں ارشادِ الٰہی ہے:

{قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُوۡحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلۡيَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًـا وَّلَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا}

"کہہ دو کہ میں تمھاری طرح کا ایک بشر ہوں (البتہ) میری طرف وحی آتی ہے کہ تمھارا معبود (وہی) ایک معبود ہے، تو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی امید رکھے، اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔"

4 سورۃ الروم (آیت:۳۱) میں ارشادِ الٰہی ہے:

{وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ} "اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔"

5 سورت آل عمران (آیت:۶۴) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ}

"کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب! جو بات ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی) ہے، اُس کی طرف آؤ، وہ یہ کہ اللہ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے۔ اگر یہ لوگ (اس بات کو) نہ مانیں تو (اُن سے) کہہ دو کہ تم گواہ رہو، ہم (اللہ کے) فرماں بردار ہیں۔"

6 سورۃ النساء (آیت:۴۸ تا ۵۰) میں فرمانِ الٰہی ہے:

{اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا . اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا . اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا}

"اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے اور جس نے اللہ کا شریک مقرر کیا، اُس نے بڑا بہتان باندھا۔ کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں (نہیں)، بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے، پاکیزہ کرتا ہے اور اُن پر دھاگے برابر بھی ظلم نہیں ہو گا۔ دیکھو یہ اللہ پر کیسا جھوٹ (طوفان) باندھتے ہیں اور یہی گناہِ صریح کافی ہے۔"

7 سورۃ الحج (آیت:۱۲،۱۱) میں فرمانِ الٰہی ہے:

{وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ نِ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ نِ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ . يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ}

"اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کنارے پر (کھڑا ہو کر) اللہ کی عبادت کرتا ہے، اگر اس کو کوئی (دنیاوی) فائدہ پہنچے تو اُس کے سبب مطمئن ہو جا (یعنی پھر کافر ہو جائے)، اُس نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی، یہی تو نقصان صریح ہے۔ یہ اللہ کے سوا ایسی چیز کو پکارتا ہے جو نہ اُسے نقصان پہنچائے اور نہ اُسے فائدہ دے سکے، یہی تو پرلے درجے کی گمراہی ہے۔"

8 سورت لقمان (آیت:۱۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

{وَاِذۡ قَالَ لُقۡمٰنُ لِابۡنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ}

"اور (اس وقت کو یاد کرو) جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا! اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، شرک تو بڑا (بھاری) ظلم ہے۔"
اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان علیہ السلام کی سب سے پہلی وصیت یہ نقل فرمائی کہ انھوں نے اپنے بیٹے کو شرک سے منع فرمایا، جس سے واضح ہوا کہ والدین کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اولاد کو شرک سے بچانے کی سب سے زیادہ کوشش کریں۔

شرک کو "ظلمِ عظیم" کہنا، بعض کے نزدیک حضرت لقمان علیہ السلام ہی کا قول ہے۔ بعض نے اسے اللہ کا قول قرار دیا ہے اور اس کی تائید میں وہ حدیث پیش کی ہے جو {اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ يَلۡبِسُوۡۤا اِيۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ} کے نزول کے تعلق سے مروی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہاں ظلم سے مراد "ظلمِ عظیم" یعنی شرک ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت {اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ ۝} کا حوالہ دیا۔[1]

مگر در حقیقت اس سے اللہ کا قول ہونے کی تائید ہوتی ہے نہ تردید۔

9 پھر سورت لقمان (آیت:۱۵) میں فرمایا:

{وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنۡ تُشۡرِكَ بِیۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا}

"اور اگر وہ تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کرے، جس کا تجھے کچھ علم نہیں تو اُن کا کہنا نہ ماننا۔"

10 سورۃ الزمر (آیت:٦٥) میں فرمانِ الٰہی ہے:

{وَلَقَدۡ اُوۡحِیَ اِلَيۡكَ وَاِلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكَ لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ}

"اور (اے نبی!) تمھاری طرف اور ان (پیغمبروں) کی طرف جو تم سے پہلے ہو چکے ہیں، یہی وحی بھیجی گئی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمھارے عمل برباد ہو جائیں گے اور تم زیاں کاروں میں سے ہو جاؤ گے۔"

11 سورۃ الذاریات (آیت:۵۱) میں فرمانِ الٰہی ہے:

{وَلاَ تَجۡعَلُوۡا مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ اِنِّیۡ لَکُمۡ مِّنۡہُ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ}

"اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بناؤ، میں اس کی طرف سے تم کو صریح ڈرانے والا ہوں۔" یعنی میں تمھیں کھول کھول کر ڈرا رہا ہوں اور تمھاری خیر خواہی کر رہا ہوں کہ صرف ایک اللہ کی طرف رجوع کرو، اسی پر اعتماد اور بھروسا کرو اور صرف اسی ایک کی عبادت کرو، اس کے ساتھ دوسرے معبودوں کو شریک مت کرو۔ ایسا کروگے تو یاد رکھنا جنت کی نعمتوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤ گے۔

-2 منکرِ قرآن نہ بنو اور نہ قرآن فروشی کرو:

1- سورۃ البقرۃ (آیت:۴۲،۴۱) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمۡ وَ لَا تَکُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ کَافِرٍۭ بِہٖ ۪ وَ لَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰیٰتِیۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۫ وَّ اِیَّایَ فَاتَّقُوۡنِ . وَ لَا تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَ تَکۡتُمُوا الۡحَقَّ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ}

"اور جو کتاب میں نے (اپنے رسول پر) نازل کی ہے جو تمھاری کتاب (تورات) کو سچا کہتی ہے، اس پر ایمان لاؤ اور اس سے منکرِ اوّل نہ بنو اور میری آیتوں میں (تحریف کر کے) ان کے بدلے تھوڑی سی قیمت (دنیاوی منفعت) نہ حاصل کرو اور مجھ ہی سے خوف رکھو اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور سچی بات کو جان بُوجھ کر نہ چھپاؤ۔"

"تھوڑی سی قیمت (دنیاوی منفعت) نہ حاصل کرو" کا یہ مطلب نہیں کہ زیادہ معاوضہ مل جائے تو احکامِ الٰہی کا سودا کر لو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کے مقابلے میں دنیاوی مفادات کو اہمیت نہ دو۔ احکامِ الٰہی تو اتنے قیمتی ہیں کہ ساری دنیا کا مال و متاع بھی ان کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ اِس آیت میں اصل مخاطب اگرچہ بنی اسرائیل ہیں، لیکن یہ حکم قیامت تک آنے والوں کے لیے ہے۔ جو بھی ابطالِ حق اور اثباتِ باطل یا کتمانِ علم کا ارتکاب اور احقاقِ حق سے محض طلبِ دنیا کے لیے گریز کرے گا، وہ اس وعید میں شامل ہو گا۔[1]

2- نیز سورۃ المائدہ (آیت:۴۴) میں فرمایا ہے:

{فَلَا تَخۡشَوُا النَّاسَ وَ اخۡشَوۡنِ وَ لَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰیٰتِیۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ؕ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ}

"تم لوگوں سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لینا اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔"

-3 جادو سیکھنا کفر ہے:

سورۃ البقرۃ (آیت:۱۰۲،۱۰۳) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

[1]مختصر تفسير للشوكاني فتح القدير (ص: ٤٧)

{وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوْا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ . وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ}

"اور اُن چیزوں کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان کے عہدِ سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے اور سلیمان نے مطلق کفر کی بات نہیں کی بلکہ شیطان ہی کفر کرتے تھے کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور اُن باتوں کے بھی (پیچھے لگ گئے تھے) جو شہر بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اتری تھیں اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے، جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو (ذریعہ) آزمایش ہیں۔ تم کفر میں نہ پڑو، غرض کہ لوگ ان سے ایسا (جادو) سیکھتے، جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں اور اللہ کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے اور کچھ ایسے (منتر) سیکھتے جو اُن کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے اور وہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسی چیزوں (سحر و منتر وغیرہ) کا خریدار ہو گا، اُس کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور جس چیز کے عوض انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا، وہ بُری تھی۔ کاش وہ (اس بات) کو جانتے اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیز گاری کرتے تو اللہ کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا۔ اے کاش! وہ اس سے واقف ہوتے۔"

.4 نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کے آداب:

سورۃ البقرۃ (آیت:۱۰۴) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ}

"اے اہلِ ایمان! (گفتگو کے وقت پیغمبر سے) "رَاعِنَا" نہ کہا کرو اور "اُنْظُرْنَا" کہا کرو اور خوب سن رکھو اور کافروں کے لیے دُکھ دینے والا عذاب ہے۔" "رَاعِنَا" کے معنیٰ ہیں ہمارا لحاظ اور خیال کیجیے۔ بات سمجھ میں نہ آئے تو سامع اس لفظ کا استعمال کر کے متکلم کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا، لیکن یہودی اپنے بُغض و عناد کی وجہ سے اس لفظ کو تھوڑا سا بگاڑ کر استعمال کرتے تھے، جس سے اس کے معنیٰ میں تبدیلی اور ان کے جذبہ عناد کی تسلی ہو جاتی، مثلاً وہ کہتے: "رَاعِيْنَا" (ہمارا چرواہا) جیسے وہ "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کے بجائے "اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ" (تم پر موت آئے) کہا کرتے

تھے، بنابریں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ''اُنْظُرْنَا'' کہا کرو۔ اس سے ایک تو یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ ایسے الفاظ جن میں تنقیص و اہانت کا شائبہ ہو، ادب و احترام کے پیشِ نظر اور سدِ ذریعہ کے طور پر ان کا استعمال کرنا صحیح نہیں۔° دوسرا مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ کفار کے ساتھ افعال اور اقوال میں مشابہت کرنے سے بچا جائے، تاکہ مسلمان جو کسی کی مشابہت اختیار کرے گا، وہ انہی میں شمار ہو گا۔'' کی وعید میں داخل نہ ہوں۔[1]

[1]سنن أبي داود،كتاب اللبا□ (۴۰۳۱) و حسنۂ الألباني في حجاب المرأة (ص: ۱۰۴)

-5 مساجد میں ذکرِ الٰہی سے روکنا ظلم اور باعثِ عذابِ عظیم ہے: سورۃ البقرۃ (آیت:۱۱۴) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِیْ خَرَابِهَا اُولٰٓىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآىِٕفِیْنَ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ}

''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے، جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے نام کا ذکر کیے جانے کو منع کرے اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو۔ ان لوگوں کو کچھ حق نہیں ہے کہ وہ اُن میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے۔ اُن کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔''

جن لوگوں نے مسجدوں میں اللہ کا ذکر کرنے سے روکا، یہ کون ہیں؟ ان کے بارے میں مفسرین کی دو رائے ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد عیسائی ہیں، جنھوں نے شاہِ روم کے ساتھ مل کر بیت المقدس میں یہودیوں کو نماز پڑھنے سے روکا اور اس کی تخریب میں حصہ لیا، لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے اس کا مصداق مشرکینِ مکہ کو قرار دیا ہے، جنھوں نے ایک تو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو مکے سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور یوں خانہ کعبہ میں مسلمانوں کو عبادت سے روکا۔ پھر صلح حدیبیہ کے موقع پر بھی یہی کردار دہرایا اور کہا کہ ہم اپنے آباو اجداد کے قاتلوں کو مکے میں داخل نہیں ہونے دیں گے، حالانکہ خانہ کعبہ میں کسی کو عبادت سے روکنے کی اجازت اور روایت نہیں تھی۔

تخریب اور بربادی صرف یہی نہیں ہے کہ اسے گرا دیا جائے اور عمارت کو نقصان پہنچایا جائے، بلکہ ان میں اللہ کی عبادت اور ذکر سے روکنا، اقامتِ شریعت اور مظاہرِ شرک سے پاک کرنے سے منع کرنا بھی تخریب اور اللہ کے گھروں کو برباد کرنا ہے۔

-6 کتمانِ شہادت۔۔۔ ظلم اور باعثِ لعنت ہے:

سورۃ البقرۃ (آیت:۱۴۰) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ}

"(اے یہود و نصاریٰ!) کیا تم اس بات کے قائل ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد یہودی یا عیسائی تھے؟ (اے نبی! ان سے) کہو کہ بھلا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ؟ اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی شہادت (گواہی) کو جو اس کے پاس (کتاب میں موجود) ہے، چھپائے اور جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو، اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہے۔" یعنی تمھیں معلوم ہے کہ یہ انبیا یہودی یا عیسائی نہیں تھے، اسی طرح تمھاری کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانیاں بھی موجود ہیں، لیکن تم اُن شہادتوں کو لوگوں سے چھپا کر ایک بڑے ظلم کا ارتکاب کر رہے ہو، جو اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں۔

کتمانِ علم۔۔۔باعثِ لعنت اور عذاب کا سبب ہے:

پارہ2{سَيَقُوْلُ} سورۃ البقرۃ (آیت:۱۵۹) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْم بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ}

"جو لوگ ہمارے احکام اور ہدایات کو جو ہم نے نازل کی ہیں (کسی غرضِ فاسد سے) چھپاتے ہیں، باوجودیکہ ہم نے اُن کو لوگوں کے (سمجھانے کے) لیے اپنی کتاب میں کھول کھول کر بیان کر دیا ہے، ایسے لوگوں پر اللہ اور تمام لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔" اللہ تعالیٰ نے جو باتیں اپنی کتاب میں نازل فرمائی ہیں، انھیں چھپانا اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ کے علاوہ دیگر لعنت کرنے والے بھی اس پر لعنت کرتے ہیں۔ حدیث میں ہے: °

"جس سے کوئی ایسی بات پوچھی گئی، جس کا اس کو علم تھا اور اس نے اسے چھپایا تو قیامت والے دن آگ کی لگام اس کے منہ میں دی جائے گی۔"[1] -

7شک نہ کرو:

1۔ سورۃ البقرۃ (آیت:۱۴۷) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ}

"(اے پیغمبر! یہ نیا قبلہ) تمھارے رب کی طرف سے حق ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔" پیغمبر پر اللہ کی طرف سے جو بھی حکم اترتا ہے، وہ یقیناً حق ہوتا ہے، اس میں شک وشبہے کی کوئی گنجایش نہیں ہوتی۔ 2۔ اسی طرح سورت آل عمران (آیت:۶۰) میں ارشادِ الٰہی ہے:

{اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ}

[1]سنن أبي داود،كتاب العلم،سنن الترمذي،رقم الحديث (۲۶۵۱ و حسنه) والنسائي و سنن ابن ماجه،مسند أحمد و المستدر رك

"(یہ بات) تمھارے پروردگار کی طرف سے حق ہے، سو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔"

3۔ ایسے ہی سورۃ الانعام (آیت:۱۱۴) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ}

''اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب (تورات) دی ہے، وہ جانتے ہیں کہ وہ تمھارے رب کی طرف سے برحق نازل ہوئی ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔''

4۔ سورت یونس (آیت:۹۴) میں فرمانِ الٰہی ہے:

{فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ}

''پس اگر تو اس چیز کے متعلق شک میں ہے جو ہم نے تیری طرف نازل کی ہے، تو جو لوگ تم سے پہلے کی (اتری ہوئی) کتابیں پڑھتے ہیں، اُن سے پوچھ لو، تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے حق آچکا ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔''

8- کفار سے مت ڈرو:

1۔ سورۃ البقرۃ (آیت:۱۵۰) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِیْ}

''سوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارا قبلہ تو اختیار کر لیا ہے، عنقریب وہ ہمارا دین بھی اپنا لیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھ سے ڈرتے رہو اور جو حکم میں دیتا ہوں، اس پر بلاخوف عمل کرتے رہو۔

2۔ سورت آل عمران (آیت:۱۷۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

{اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ}

''یہ (خوف دلانے والا) تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، اگر تم مومن ہو تو اُن سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا۔''

یعنی جب وہ تمھیں اس وہم میں مبتلا کرے تو تم صرف مجھ ہی پر بھروسا رکھو اور میری ہی طرف رجوع کرو، میں تمھیں کافی ہو جائوں گا اور تمھارا ناصر ہوں گا، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا:

{اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ} [الزمر:٣٦]

''کیااللہ اپنے بندے کو کافی نہیں ہے ؟''

3۔ سورۃ المائدہ (آیت:۴۴) میں ارشادِ الٰہی ہے:

{فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ}

''تم لوگوں سے مت ڈرنااور مجھ ہی سے ڈرتے رہنااور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لینااور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔'' ''تھوڑی سی قیمت'' کی تفصیل ابھی قریب ہی نمبر (۲) کے تحت گزری ہے۔ 9- ناشکری نہ کرو: 1۔ سورۃ البقرۃ (آیت:۱۵۲) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ}

''تم مجھے یاد کیا کرو، میں تمھیں یاد کیا کروں گا اور میرا احسان مانتے رہنااور ناشکری نہ کرنا۔'' ذکر یعنی یاد کرنے کا مطلب ہر وقت اللہ کو یاد کرنا ہے، یعنی اُس کی تسبیح اور تکبیر بلند کرو۔ شکر کا مطلب اللہ کی دی ہوئی قوتوں اور توانائیوں کو اس کی اطاعت میں صرف کرنا ہے۔ خداداد قوتوں کو اللہ کی نافرمانی میں صرف کرنا، یہ اللہ کی ناشکر گزاری (کفرانِ نعمت) ہے۔ شکر کرنے پر مزید احسانات کی نوید اور ناشکری پر عذابِ شدید کی وعید ہے۔

2۔ سورت ابراہیم (آیت:۷) میں فرمایا:

{وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ}

''اور جب تمھارے رب نے (تم کو) آگاہ کیا کہ اگر شکر کروگے تو میں تمھیں زیادہ دوں گا اور اگر ناشکری کروگے تو (یاد رکھو کہ) میرا عذاب (بھی) سخت ہے۔''

10- شہید کو مردہ نہ کہو:

1۔ سورۃ البقرۃ (آیت:۱۵۴) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ}

"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے (شہید ہو) جائیں، اُن کی نسبت یہ نہ کہنا کہ وہ مرے ہوئے ہیں (وہ مردہ نہیں) بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم نہیں جان ٭شہدا کو مردہ نہ کہنا، ان کے اعزاز اور تکریم کے لیے ہے۔ ان کی یہ زندگی برزخ کی زندگی ہے، جس کو ہم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہ زندگی اعلیٰ قدر مراتب انبیا و مومنین، حتیٰ کہ کفار کو بھی حاصل ہے۔ شہید کی روح اور بعض روایات میں مومن کی روح بھی ایک پرندے کی طرح جنت میں جہاں چاہتی ہیں، پھرتی رہتی ہیں۔[1]

2۔ سورت آل عمران (آیت:۱۶۹) میں بھی ارشادِ الٰہی ہے:

{وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ}

"جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے اُن کو مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ اللہ کے نزدیک زندہ ہیں اور اُن کو رزق مل رہا ہے۔"
11- شیطان کی پیروی مت کرو:

1۔ سورۃ البقرۃ (آیت:۱۶۸) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ}

"لوگو! جو چیزیں زمین میں حلال طیب ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو، وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔"

یعنی شیطان کے پیچھے لگ کر اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام مت کرو، جس طرح مشرکین نے کیا کہ اپنے بتوں کے نام وقف کردہ جانوروں کو وہ حرام کر لیتے تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

[1]دیکھیں : تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۶۸)

٭"میں نے اپنے بندوں کو حنیف پیدا کیا، پس شیطان نے ان کو دین سے گمراہ کر دیا اور جو چیزیں میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں، وہ اس نے ان پر حرام کر دیں۔"[1]

2۔ سورۃ البقرۃ (آیت:۲۰۸) میں ارشادِ الٰہی ہے:

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ}

"مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو وہ تو تمھارا صریح دشمن ہے۔"

اہلِ ایمان کو کہا جارہا ہے کہ اسلام میں پورے پورے داخل ہو جائو اور اس طرح نہ کرو کہ جو باتیں تمھاری مصلحتوں اور خواہشات کے مطابق ہوں، ان پر تو عمل کر لو، لیکن دوسرے حکموں کو نظر انداز کر دو، اس طرح جو دین تم چھوڑ آئے ہو، اس کی باتیں اسلام میں شامل کرنے کی کوشش مت کرو، بلکہ صرف اسلام کو مکمل طور پر اپنائو۔

اس سے دین میں بدعات کی بھی نفی کر دی گئی اور آج کل کے سیکولر ذہن کی تردید بھی، جو اسلام کو مکمل طور پر اپنانے کے لیے تیار نہیں، بلکہ دین کو عبادت، یعنی مساجد تک محدود کرنا اور سیاست اور ایوانِ حکومت سے دیس نکالا دینا چاہتا ہے۔ اسی طرح عوام کو بھی سمجھایا جارہا ہے، جو رسوم ورواج اور علاقائی ثقافت وروایات کو پسند کرتے ہیں اور انھیں چھوڑنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے، جیسے مرگ اور شادی بیاہ کی مسرفانہ اور ہندوانہ رسوم اور دیگر رواج وغیرہ اور یہ کہا جارہا ہے کہ شیطان کے قدموں کی پیروی مت کرو، جو تمھیں خلافِ اسلام باتوں کے لیے حسین فلسفے تراش کر پیش کرتا، برائیوں پر خوش نما غلاف چڑھاتا اور بدعات کو بھی نیکی باور کراتا

[1]صحيح مسلم،كتاب الجنّة (۶۳/ ۲۸۶۵)

ہے، تاکہ اس کے دامِ ہم رنگِ زمین میں پھنسے رہو۔

3۔ سورۃ الانعام (آیت:۱۴۲) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ}

"اور چوپایوں میں بوجھ اٹھانے والے (بڑے بڑے) بھی پیدا کیے اور زمین سے لگے ہوئے (چھوٹے چھوٹے) بھی (پس) اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو، وہ تمھارا صریح دشمن ہے۔" شیطان کے قدم بہ قدم نہ چلو، جس طرح مشرکین اس کے پیچھے لگ گئے تھے اور حلال جانوروں کو بھی اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، گویا اللہ کی حلال کردہ چیز کو حرام اور حرام کو حلال کر لیا، یہ بھی شیطان کی پیروی ہے۔

4۔ سورۃ النور (آیت:۲۱) میں ارشادِ الٰہی ہے:

{يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ}

"اے مومنو! شیطان کے قدموں پر نہ چلنا اور جو شخص شیطان کے قدموں پر چلے گا تو شیطان تو بے حیائی (کی باتیں) اور بُرے کام ہی بتائے گا اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی تو ایک شخص بھی تم میں پاک نہ ہو سکتا، مگر جس کو اللہ چاہتا ہے، پاک کر دیتا ہے (اور) اللہ سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔"

12- کون سی اشیا حرام ہیں؟

1۔ سورۃ البقرۃ (آیت:۱۷۳) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ}

"اُس نے تم پر مرا ہوا جانور اور (بہاہوا) خون اور سُوَر کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام کر دیا ہے۔ہاں! جو ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے،اُس پر کچھ گناہ نہیں،بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے۔

" اس آیت میں چار حرام کردہ چیزوں کا ذکر ہے، لیکن اسے کلمہ حصر {اِنَّمَا} کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جس سے ذہن میں یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ حرام صرف یہی چار چیزیں ہیں، حالانکہ ان کے علاوہ بھی کئی چیزیں حرام ہیں۔اس لیے اول تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ حصر ایک خاص سیاق میں آیا ہے،یعنی مشرکین کے اس فعل کے ضمن میں کہ وہ حلال جانوروں کو بھی حرام قرار دے لیتے تھے،اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ حرام نہیں، حرام تو صرف یہ چیزیں ہیں؛اس لیے یہ حصر اضافی ہے،یعنی اس کے علاوہ بھی دیگر منع کردہ چیزیں ہیں، جن کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا،مثلاً وہ درندہ جو کچلیوں سے شکار کرے اور پرندوں میں جو پنجوں سے شکار کرے، تیسرے جن جانوروں کی حرمت حدیث سے ثابت ہے؛ مثلاً گھریلو گدھا، کتا وغیرہ بھی حرام ہیں۔ 2۔ سورۃ المائدہ (آیت:۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

{حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَ الْمُنْخَنِقَةُ وَ الْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّيَةُ وَ النَّطِيْحَةُ وَ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ}

"تم پر مرا ہوا جانور اور (بہاہوا) خون اور سُوَر کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے اور جو چوٹ لگ کر مر جائے اور جو گر کر مر جائے اور جو سینگ لگ کر مر جائے، یہ سب حرام ہیں اور وہ جانور بھی جس کو درندے پھاڑ کھائیں، مگر جس کو تم (مرنے سے پہلے) ذبح کر لو اور وہ جانور بھی جو تھان (آستانہ) پر ذبح کیا جائے اور یہ بھی کہ پانسوں سے قسمت معلوم کرو یہ سب گناہ (کے کام) ہیں۔"

بھوک کی اضطراری کیفیت میں مذکورہ محرمات کے کھانے کی اجازت ہے، بشرطیکہ مقصد اللہ کی نافرمانی اور حد سے تجاوز کرنا نہ ہو، صرف جان بچانا مطلوب ہو۔

3۔ سورۃ الانعام (آیت:۱۴۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

{قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْدَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ} ''کہو کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں، میں اُن میں کوئی چیز جسے کھانے والا کھائے حرام نہیں پاتا، بہ جز اس کے کہ وہ مرا ہوا جانور ہو یا بہتا خون یا سُوَر کا گوشت کہ یہ سب ناپاک ہیں یا کوئی گناہ کی چیز ہو کہ اُس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو اور اگر کوئی مجبور ہو جائے، لیکن نہ تو نافرمانی کرے اور نہ حد سے باہر نکل جائے تو تمھارا رب بخشنے والا مہربان ہے۔'' اس آیت میں جن چار محرمات کا ذکر ہے، ان کی ضروری تفصیل اس موضوع کے آغاز میں سورت بقرہ (آیت:۱۷۳) کے تحت گزر چکی ہے، یہاں یہ نکتہ مزید قابلِ وضاحت ہے کہ ان چار محرمات کا ذکر کلمہ حصر سے کیا گیا ہے، جس سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان چار قسموں کے علاوہ باقی تمام جانور حلال ہیں، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ ان چار کے علاوہ دوسرے جانور بھی شریعت میں حرام ہیں، پھر یہاں حصر کیوں کیا گیا؟ بات دراصل یہ ہے کہ اس سے قبل مشرکین کے جاہلانہ طریقوں اور ان کے رد کا بیان چلا آرہا ہے۔

ان ہی میں بعض جانوروں کا بھی ذکر آیا ہے، جو انھوں نے اپنے طور پر حرام کر رکھے تھے۔ اس سیاق میں یہ کہا جارہا ہے کہ مجھ پر جو وحی کی گئی ہے، اس میں اس سے مقصود مشرکین کے حرام کردہ جانوروں کی حلت ہے، یعنی وہ حرام نہیں ہیں، کیوں کہ اللہ نے جن محرمات کا ذکر کیا ہے، ان میں تو وہ شامل ہی نہیں ہیں۔ اگر وہ حرام ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کا بھی ذکر ضرور کرتا۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس کی توجیہ اس طرح کی ہے کہ اگر یہ آیت مکی نہ ہوتی تو پھر یقینا محرمات کا حصر قابلِ تسلیم تھا، لیکن چوں کہ اس کے بعد خود قرآن نے سورۃ المائدہ میں بعض محرمات کا ذکر کیا ہے اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کچھ محرمات بیان فرمائے ہیں تو اب وہ بھی ان میں شامل ہوں گے۔

4۔ سورۃ النحل (آیت:۱۱۵) میں ارشاد فرمایا ہے:

{اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ}

''اُس نے تم پر مردار اور خون اور سُوَر کا گوشت حرام کر دیا اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے (اُس کو بھی)، ہاں اگر کوئی ناچار ہو جائے تو بشر طیکہ گناہ کرنے والا نہ ہو اور نہ حد سے نکلنے والا تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔'' یہ آیت اس سے قبل تین مرتبہ پہلے بھی گزر چکی ہے۔

یہ چوتھا مقام ہے۔ ان آیات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان میں جن چار محرمات کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ ان سے مسلمانوں کو نہایت تاکید کے ساتھ بچانا چاہتا ہے۔ اس میں (جس چیز پر اللہ کے سوا دوسرے کا نام پکارا جائے) جو چوتھی قسم ہے، اس کے مفہوم میں تاویلات کو سامنے رکھ کر شرک کے لیے چور دروازہ تلاش کیا جاتا ہے۔

13- حالتِ اعتکاف میں مباشرت کی ممانعت: سورۃ البقرۃ (آیت:۱۸۷) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ}

"پھر روزہ (رکھ کر) رات تک پورا کرو اور جب مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو اُن (بیویوں) سے مباشرت نہ کرو۔" اعتکاف کی حالت میں بیوی سے مباشرت اور بوس و کنار کی اجازت نہیں ہے، البتہ ملاقات اور بات چیت جائز ہے۔ اعتکاف کے لیے مسجد ضروری ہے، چاہے اعتکاف کرنے والا مرد ہو یا عورت۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں نے بھی مسجد میں اعتکاف کیا۔ اس لیے عورتوں کا اپنے گھر میں اعتکاف بیٹھنا صحیح نہیں، البتہ مسجد میں ان کے لیے ہر چیز کا مردوں سے الگ انتظام کرنا ضروری ہے، تاکہ مردوں سے کسی طرح کا میل جول نہ ہو۔ جب تک مسجد میں معقول، محفوظ اور مردوں سے بالکل الگ انتظام نہ ہو، عورتوں کو مسجد میں اعتکاف بیٹھنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ یہ ایک نفلی عبادت ہے، جب تک پوری طرح تحفظ نہ ہو، اس نفلی عبادت سے گریز بہتر ہے۔ فقہ کا اصول ہے: "مصالح کے حصول کے مقابلے میں مفاسد سے بچاؤ زیادہ ضروری ہے۔"

-14 کسی کا مال ناحق نہ کھاؤ:

1۔ سورۃ البقرۃ (آیت:۱۸۸) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَ لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ وَ تُدۡلُوۡا بِهَاۤ اِلَی الۡحُکَّامِ لِتَاۡکُلُوۡا فَرِیۡقًا مِّنۡ اَمۡوَالِ النَّاسِ بِالۡاِثۡمِ وَ اَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ}

"اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ اور نہ اُس کو (رشوتاً) حاکموں کے پاس پہنچاؤ، تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ناجائز طور پر کھا جاؤ اور (اسے) تم جانتے بھی ہو۔"

○ یہ ایسے شخص کے بارے میں ہے، جس کے پاس کسی کا حق ہو، لیکن حق والے کے پاس ثبوت نہ ہو، اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر وہ عدالت یا حاکم مجاز سے اپنے حق میں فیصلہ کروالے اور اس طرح دوسرے کا حق غصب کرلے۔ یہ ظلم اور حرام ہے۔ عدالت کا فیصلہ ظلم اور حرام کو جائز اور حلال نہیں کر سکتا، یہ ظالم عند اللہ مجرم ہو گا۔[1]

2۔ سورۃ النساء (آیت:۲۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

{یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَ تِجَارَۃً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡکُمۡ وَ لَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ}

[1]مختصر تفسير ابن كثير للرفاعي (١/ ١٥٠)

"مومنو! ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ، ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو (اور اس سے مالی فائدہ ہو جائے تو وہ جائز ہے) اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔"

{ بِالْبَاطِلِ } میں دھوکا، فریب، جعل سازی اور ملاوٹ کے علاوہ تمام ایسے کاروبار بھی شامل ہیں، جن سے شریعت نے منع کیا ہے، جیسے قمار (جوا) اور سود و رشوت۔ اسی طرح ممنوع اور حرام چیزوں کا کاروبار کرنا بھی باطل میں شامل ہے، مثلاً بلا ضرورت فوٹو گرافی، ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر، ویڈیو فلموں کا بنانا، بیچنا اور مرمت کرنا وغیرہ سب ناجائز ہے۔

{ وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ } "اپنے آپ کو قتل و ہلاک نہ کرو۔" سے مراد خود کشی بھی ہو سکتی ہے جو کبیرہ گناہ ہے اور ارتکابِ معصیت بھی جو ہلاکت کا باعث ہے اور کسی مسلمان کو قتل کرنا بھی، کیوں کہ مسلمان جسد واحد کی طرح ہے۔ اس لیے اس کا قتل بھی ایسا ہی ہے، جیسے اپنے آپ کو قتل کیا۔

-15 جنگ میں بھی زیادتی نہ کرو:

سورۃ البقرۃ (آیت:۱۹۰) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{ وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ }

"اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی اللہ کی راہ میں اُن سے لڑو، مگر زیادتی نہ کرنا کہ اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

اس آیت میں پہلی مرتبہ ان لوگوں سے لڑنے کی اجازت دی گئی جو مسلمانوں سے آمادۂ قتال رہتے تھے۔ تاہم زیادتی سے منع فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں، ° بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرو، جن کا جنگ میں حصہ نہ ہو، اسی طرح درخت وغیرہ جلا دینا یا جانوروں کو بغیر مصلحت کے مار ڈالنا بھی زیادتی ہے، جس سے بچا جائے۔[1]

-16 حرم میں لڑائی نہ کرنا:

سورۃ البقرۃ (آیت:۱۹۱) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى یُقٰتِلُوْكُمْ فِیْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ }

"اور جب تک وہ تم سے مسجد (خانہ کعبہ) کے پاس نہ لڑیں، تم بھی وہاں اُن سے نہ لڑنا، ہاں اگر وہ تم سے لڑیں تو تم اُن کو قتل کر ڈالو، کافروں کی یہی سزا ہے۔" حدودِ حرم میں قتال منع ہے، لیکن اگر کفار اس کی حرمت کو ملحوظ نہ رکھیں اور تم سے لڑیں تو تمھیں بھی ان سے لڑنے کی اجازت ہے۔

-17 اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو:

سورۃ البقرۃ (آیت:۱۹۵) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ}

"اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

اس سے بعض نے ترکِ انفاق، بعض نے ترکِ جہاد اور بعض نے گناہ پر گناہ کیے جانا مراد لیا ہے اور یہ ساری ہی صورتیں ہلاکت کی ہیں۔ جہاد چھوڑ دوگے یا جہاد میں اپنا مال صرف کرنے سے گریز کروگے تو یقیناً دشمن قوی ہوگا اور تم کمزور ہوگے، جس کا نتیجہ تباہی ہے۔

18- ممنوعاتِ حج: سورۃ البقرۃ (آیت:۱۹۷) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ}

"حج (کے دنوں) میں عورتوں سے اختلاط کرے نہ کوئی بُرا کام کرے اور نہ کسی سے جھگڑے۔" صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مروی ہے: ٥"جس نے حج کیا اور شہوانی باتوں اور فسق وفجور سے بچا، وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے، جیسے اس دن پاک تھا جب اسے اس کی ماں نے جنا تھا۔"[1] -

19 کفرانِ نعمت کی سزا اور تقوے کی جزا: سورۃ البقرہ (آیت:۲۱۲،۲۱۱) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ . زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ}

"(اے نبی!) بنی اسرائیل سے پوچھو کہ ہم نے اُن کو کتنی کھلی نشانیاں دیں اور جو شخص اللہ کی نعمت کو اپنے پاس آنے کے بعد بدل دے تو اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے۔ اور جو کافر ہیں ان کے لیے دنیا کی زندگی خوش نما کر دی گئی ہے اور وہ مومنوں سے تمسخر کرتے ہیں، لیکن جو

[1]صحيح البخاري،رقم الحديث (١٨٢٠) صحيح مسلم (٥/ ٩/ ١١٩)

پرہیزگار ہیں وہ قیامت کے دن اُن پر غالب ہوں گے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔"

20- حرمت والے مہینوں میں قتال کی ممانعت اور فتنہ، قتل سے بڑا گناہ ہے:

سورۃ البقرۃ (آیت:۲۱۷) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ}

"(اے نبی!) لوگ تم سے عزت والے مہینوں میں لڑائی کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہہ دو کہ اُن میں لڑنا بڑا (گناہ) ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اُس سے کفر کرنا اور مسجد حرام (خانہ کعبہ میں جانے) سے (بند کرنا) اور اہلِ مسجد کو اُس میں سے نکال دینا (جو یہ کفار کرتے ہیں) اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ (گناہ) ہے اور فتنہ انگیزی خون ریزی سے بھی بڑھ کر ہے۔"

-21 ارتداد (مرتد ہو جانے) کی سزا:

سورۃ البقرۃ (آیت:۲۱۷) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَ لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ}

"اور یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے، یہاں تک کہ اگر قدرت رکھیں تو تمھیں تمھارے دین سے پھیر دیں اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر کر (کافر ہو) جائے گا اور کافر ہی مرے گا تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں برباد ہو جائیں گے اور یہی لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں، جس میں ہمیشہ رہیں گے۔" جو دینِ اسلام سے پھر جائے، یعنی مرتد ہو جائے (اگر وہ توبہ نہ کرے) تو اس کی دنیوی سزا قتل ہے۔ حدیث نبوی میں ہے: "جس نے اپنا دین بدلا، اسے قتل کر دو۔"[1]

° اس آیت میں اس کی اخروی سزا بیان کی جا رہی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ ایمان کی حالت میں کیے گئے اعمالِ صالحہ بھی کفر کی وجہ سے کالعدم ہو جائیں گے اور جس طرح ایمان قبول کرنے سے انسان کے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اسی طرح کفر سے تمام نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ تاہم قرآن کے الفاظ سے واضح ہے کہ حبطِ اعمال اسی وقت ہو گا، جب خاتمہ کفر پر ہو گا، اگر موت سے پہلے تائب ہو جائے گا تو ایسا نہیں ہو گا، یعنی مرتد کی توبہ قبول ہے۔

-22 شراب وجوا اور بتوں پانسوں کی حرمت:

1۔ سورۃ البقرۃ (آیت:۲۱۹) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا}

"(اے پیغمبر!) لوگ تم سے شراب اور جوے کا حکم دریافت کرتے ہیں تو کہہ دو کہ اُن میں نقصان بڑے ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں، مگر اُن کے نقصان فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں۔"

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠١٧)

فائدوں کا تعلق دنیا سے ہے، مثلاً شراب سے بہ ظاہر وقتی طور پر بدن میں چستی اور بعض ذہنوں میں تیزی آجاتی ہے اور جنسی قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے، جس کے لیے اس کا استعمال عام ہو تا ہے۔ اسی طرح اس کی خرید و فروخت نفع بخش کاروبار ہے۔ جوئے میں بھی بعض دفعہ آدمی جیت جاتا ہے تو اس کو کچھ مال مل جاتا ہے، لیکن یہ فائدے ان نقصانات کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے جو انسان کی عقل اور اس کے دین کو ان سے پہنچتے ہیں۔

2۔ سورۃ المائدہ (آیت:۹۰،۹۱) میں ارشادِ الٰہی ہے:

{یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ . اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ}

"اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے (یہ سب) ناپاک کام اعمالِ شیطان سے ہیں، سو ان سے بچتے رہنا تاکہ تم نجات پاؤ۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے سبب تمھارے مابین دشمنی اور رنجش ڈلوا دے اور تمھیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو تمھیں (ان کاموں سے) باز رہنا چاہیے۔"

یہ شراب کے بارے میں تیسرا حکم ہے، پہلے دوسرے حکم میں صاف طور پر ممانعت نہیں فرمائی گئی۔ لیکن یہاں اسے اور اس کے ساتھ جوا، پرستش گاہوں یا آستانوں اور فال کے تیروں کو "رجس" (پلید) اور شیطانی کام قرار دے کر صاف لفظوں میں ان سے اجتناب کا حکم دے دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت میں شراب اور جوے کے مزید نقصانات بیان کر کے سوال کیا گیا ہے کہ اب بھی باز آجاؤ گے یا نہیں؟ جس سے مقصود اہلِ ایمان کی آزمایش ہے، چنانچہ جو اہلِ ایمان تھے، وہ تو منشاے الٰہی سمجھ گئے اور اس کی قطعی حرمت کے قائل ہو گئے اور کہا: اِنْتَهَیْنَا رَبَّنَا! اے رب! ہم باز آگئے۔[1]

لیکن آج کل کے بعض "دانشور" کہتے ہیں کہ اللہ نے شراب کو حرام کہاں قرار دیا ہے؟ ع؎

بریں عقل و دانش بباید گریست

.23 مشرک سے نکاح نہ کرو:

سورۃ البقرۃ (آیت:۲۲۱) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى یُؤْمِنَّ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَتّٰى یُؤْمِنُوْا وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَیْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓىٕكَ یَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَ اللّٰهُ یَدْعُوْۤا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ وَ یُبَیِّنُ اٰیٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ}

’’اور (مومنو!) مشرک عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں (اُن سے) نکاح نہ کرنا، کیوں کہ مشرک عورت خواہ تمھیں کیسی ہی بھلی لگے، اُس سے مومن لونڈی بہتر ہے اور (اسی طرح) مشرک مرد جب تک ایمان نہ لائیں، مومن عورتوں کو اُن کی زوجیت میں نہ دینا کیوں کہ مشرک (مرد) خواہ وہ تمھیں کیسا ہی بھلا لگے (اُس سے) مومن غلام بہتر ہے یہ (مشرک، لوگوں کو) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ

[1]مسند أحمد (۲/ ۳۵۱)

اپنی مہربانی سے بہشت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اور اپنے حکم لوگوں سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ نصیحت حاصل کریں۔‘‘ ٥مشرک عورتوں سے مراد بتوں کی پجاری عورتیں ہیں، اہلِ کتاب (یہودی یا عیسائی) عورتوں سے نکاح کی اجازت قرآن نے دی ہے، البتہ کسی مسلمان عورت کا نکاح کسی اہلِ کتاب مرد سے نہیں ہو سکتا۔ تاہم حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے مصلحتاً اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کو ناپسند کیا۔[1]

-24ایامِ حیض میں جماع کی حرمت: سورۃ البقرۃ (آیت:۲۲۲) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ}

’’اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہہ دو کہ وہ تو گندگی ہے، سو ایامِ حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو اور جب تک پاک نہ ہو جائیں اُن سے مقاربت نہ کرو۔ ہاں جب پاک ہو جائیں تو جس طریق سے اللہ تعالیٰ نے تمھیں ارشاد فرمایا ہے، اُن کے پاس جاؤ، کچھ شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔‘‘ بلوغت کے بعد ہر عورت کو ایامِ ماہواری میں جو خون آتا ہے، اسے حیض کہا جاتا ہے۔ بعض دفعہ عادت کے خلاف بیماری کی وجہ سے خون آتا ہے، اسے استحاضہ

[1] 1]تفسير ابن كثير (۱/ ۲۲۴) طبع بيروت۔

کہتے ہیں، جس کا حکم حیض سے مختلف ہے۔ حیض کے ایام میں عورت کو نماز معاف ہے اور روزے رکھنے ممنوع ہیں، تاہم روزوں کی قضا بعد میں ضروری ہے، لیکن نماز کی نہیں۔ مردوں کے لیے صرف ہم بستری سے منع کیا ہے، البتہ بوس و کنار جائز ہے، اسی طرح عورت ان دنوں میں کھانا پکانا اور دیگر کام کر سکتی ہے۔ جس طریق یعنی شرم گاہ سے اجازت ہے صرف اُسی سے جماع کرو، کیوں کہ حالتِ حیض میں بھی اسی سے روکا گیا تھا اور اب پاک ہونے کے بعد جو اجازت دی جا رہی ہے تو اس کا مطلب صرف فرج (شرم گاہ) کی اجازت ہے، نہ کہ کسی اور حصے کی۔

اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ عورت کی دبر کا استعمال حرام ہے، جیسا کہ احادیث میں اس کی مزید وضاحت و صراحت کر دی گئی ہے۔

-25ممنوع قسمیں اور انھیں توڑنے کا کفارہ:

سورۃ البقرۃ (آیت:۲۲۴) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ }

"اور اللہ (کے نام) کو اس بات کا حیلہ نہ بنانا کہ (اُس کی) قسمیں کھا کھا کر بھلائی کرنے اور پرہیز گاری کرنے اور لوگوں میں صلح و سازگاری کرانے سے رک جاؤ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

غصے میں اس طرح کی قسم مت کھائو کہ فلاں کے ساتھ نیکی نہیں کروں گا، فلاں سے نہیں بولوں گا، فلاں فلاں کے درمیان صلح نہیں کرائوں گا۔ اس طرح کی قسموں کے لیے حدیث میں کہا گیا ہے کہ اگر قسم کھالو تو انھیں توڑ دو اور قسم کا کفارہ ادا کرو۔ قسم کا کفارہ سورۃ المائدہ (آیت:۸۹) میں آیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

{لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ وَ احْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ }"

اللہ تمھاری بے ارادہ قسموں پر تم سے مواخذہ نہ کرے گا، لیکن پختہ قسموں پر (جن کے خلاف کرو گے) مواخذہ کرے گا تو اُس کا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو یا اُن کو کپڑے دینا یا ایک غلام آزاد کرنا اور جس کو یہ میسر نہ ہو، وہ تین روزے رکھے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے، جب تم قسم کھالو (اور اسے توڑ دو) اور (تم کو) چاہیے کہ اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ اس طرح اللہ تمھارے (سمجھانے کے) لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے، تاکہ تم شکر کرو۔"

اسباب نزول

سعید بن مسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جب صہیب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کرکے آنے لگے تو مشرکین نے ان کا پیچھا کیا۔ سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ اپنی سواری سے اترے اور تیر کمان اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے، گویا ہوئے: او قریشیو! تم جانتے ہو کہ میں تم سب سے زیادہ ماہر تیر انداز ہوں اور اللہ کی قسم! جب تک میرے ترکش میں ایک بھی تیر باقی ہے تم مجھ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور اگر تیر ختم ہو گئے تو تلوار میرے پاس ہے اور میں تلوار چلانا بھی خوب جانتا ہوں۔ اب تم جو چاہو کرو۔

وہ کہنے لگے: تم ہمیں اپنے مال اور گھر کا پتہ بتا دو، ہم تمھیں چھوڑ دیں گے۔ صہیب رضی اللہ عنہ نے یہ شرط منظور کرلی اور انھیں اپنے گھر اور مال کے بارے میں بتا دیا۔ جب مدینہ پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابو یحییٰ! تو نے نہایت ہی نفع مند تجارت کی ہے۔" اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللهِ وَاللهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ﴾

''اور بعض لوگ وہ بھی ہیں کہ اللہ کی رضامندی کی خاطر اپنی جان تک بیچ ڈالتے

ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر بڑی شفقت کرنے والا ہے۔'' [1]

مفسرین کرام فرماتے ہیں: مشرکین مکہ صہیب رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر عذاب دیتے رہے۔ صہیب رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ''میں ایک بڑی عمر کا آدمی ہوں، تم میں رہوں یا نہ رہوں اس سے تمھیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیا تم ایسا کرتے ہو کہ میں تمھیں اپنا مال دے دوں اور تم میرے اور میرے دین کے درمیان رکاوٹ نہ بنو؟'' انھوں نے یہ بات مان لی۔ آپ نے یہ شرط بھی لگائی تھی کہ میں اپنی سواری اور زاد راہ رکھ لوں گا، چنانچہ وہ ہجرت کرکے مدینہ آگئے۔ مدینہ میں سیدنا ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے بہت سے لوگوں کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور کہا: ''ابویحییٰ! تیری بیع تو نفع میں رہی ہے۔''

صہیب رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''اللہ تعالیٰ آپ کو بھی نفع دے، میں کچھ سمجھا نہیں؟'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے آپ کی شان میں یہ آیت نازل کی ہے۔'' انھوں نے مذکورہ آیت کی تلاوت سنائی۔ امام حاکم نے اپنی مستدرک میں دو طرق سے یہ روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت امام مسلم رحمہ اللہ کی شرط پر پوری اترتی ہے۔

ابن جریر نے عکرمہ کے حوالے سے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت مبارک صہیب، ابوذر اور جندب بن سکن رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ زیادہ تر مفسرین نے اس پر محمول کیا ہے کہ یہ آیت ہر مجاہد کے بارے میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[1]البقرۃ 2: 207-

﴿ إِنَّ اللهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴾

''بلاشبہ اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔ وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، اس پر سچا وعدہ کیا گیا ہے تورات میں اور انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ کون اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہے، پس تم لوگ اپنی اس بیع پر جس کا تم نے معاملہ ٹھہرایا ہے خوش ہو جاؤ اور یہ عظیم کامیابی ہے۔''[1]

[1]التوبۃ 9: 111-

ضمیمہ

اسلام کے طبقۂ اولی کے لوگوں پر اسلام کا کیسا اثر ہوا؟ وہ کون سے عطیات اور گوہر نایاب تھے جو اسلام نے انھیں عطا کیے اور جن کے لیے انھوں نے اپنے اہل و عیال، مال و دولت اور اولاد کو قربان کر ڈالا؟

حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہی وہ چیزیں ہیں جن کی محبت انسان کو بہرہ، گونگا اور اندھا بنا دیتی ہے اور بڑی مشقت سے ہی ان سے خلاصی پا سکتا ہے جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ ﴾

"مرغوب چیزوں کی محبت لوگوں کے لیے مزین کر دی گئی ہے، جیسے عورتیں اور بیٹے، سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے۔" [1]

چنانچہ انھوں نے ان چیزوں کی محبت سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا؟ اور ان چیزوں کی قید سے کیسے آزادی حاصل کی؟ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ان لوگوں نے کیسے نجات حاصل کی۔ ان لوگوں کے مضبوط ایمان نے ان اشیا کی محبت سے انھیں دور رکھا۔ وہ ایمان جو ان کے دلوں کی

[1]آل عمران 3 :14-

تہہ تک پہنچ چکا تھا اور ان کے جسم کے ہر عضو پر ایمان حاکم تھا۔ اس بے مثال ایمان نے ان کے سامنے دنیا کی حقیقت کھول کر رکھ دی جیسا کہ اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں دنیا کی بے ثباتی کو واضح کیا ہے، اس لیے انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ چیزیں محض دنیا کی زیب و زینت ہیں۔ سامانِ آرائش اور سامان آخرت کے درمیان فرق کی اہمیت ان کے سامنے عیاں تھی۔

سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ نے جب ایمان کا ذائقہ چکھا تو دنیا کی لذتوں کو بھول ہی گئے۔ اسی طرح عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور دوسرے وہ سب مہاجرین جو اپنے دین کی خاطر مکہ چھوڑ کر مدینہ کو چل دیے اور اپنے مال و زر اور اہل و عیال سے لاتعلق ہو گئے۔ انھوں نے بھی اس دنیا کی حقیقت کو جان لیا تھا۔ صہیب رضی اللہ عنہ نے ایمان کی معرفت حاصل کرنے کے بعد کیا کیا؟

سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ نے اپنا مال، اپنی زندگی اور ہر وہ چیز جس کا اس دنیا سے تعلق تھا ایک پلڑے میں رکھا اور دوسرے پلڑے میں اپنا دین، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو رکھا تو دوسرا پلڑا جھک گیا، چنانچہ وہ مہاجر الی اللہ بن کر مدینہ کو کوچ کر گئے۔ لیکن! ہمارے اس موجودہ دور میں عام مشاہدہ میں آتا ہے کہ لوگ مال و منال جمع کرنے میں مشغول ہیں۔ وہ اس کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ انھیں اتنا حرص و لالچ ہے کہ اس بات کی کوئی پرواہ نہیں آیا مال جائز ذرائع سے آ رہا ہے یا ناجائز ذرائع سے، شرعی حدود کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ ذریعہ معاش انسانی عزت و عظمت کے موافق ہے

یا نہیں۔ دولت کے پجاری ان میں سے کسی بات کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ آپ دیکھیں گے کہ بندۂ درہم و دینار کے نزدیک سب سے قیمتی چیز اور مشغلہ مال جمع کرنا ہے جبکہ ایسے لوگوں کے نزدیک اولاد اور بیوی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ دینی تعلیمات اور اللہ تعالیٰ کے احکامات سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ عمریں گزر جاتی ہیں، جوانیاں بیت جاتی ہیں لیکن وہ اسی میں مشغول رہتے ہیں، منافع اور خسارے کا بیلنس چیک کرتے ہوئے بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ اس دنیا کی حقیقت کو پہچان لیتے ہیں۔

جب عالم شباب عالم شیب (بڑھاپے) میں تبدیل ہو جاتا ہے اور دنیا انھیں فٹ پاتھ پر پھینک دیتی ہے تب ان کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ کچھ بدنصیب تو ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں اس وقت تک بھی ہوش نہیں آتا اور ہوسِ زرّ ختم نہیں ہوتی جب تک کہ ملک الموت کو دیکھ نہ لیں۔

اگر! اگر یہ لوگ اپنی عقل سے کام لیں تو انھیں پتا چل جائے کہ یہ مال وزر ایک جلد زائل ہونے والی چیز ہے اور اس کی حیثیت مستعار (ادھار) لی گئی شے کی طرح ہے جسے ضرورت کے لیے ہی استعمال کرتے ہیں، اس لیے کوئی حکمت اور دانائی والی بات نہیں ہو گی کہ ہم قانون حیات اور قانون فطرت کو تبدیل کرتے پھریں، اپنا مال کمر پر لادے ایک بینک سے دوسرے بینک منتقل کرتے پھریں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ہانکتے پھریں۔ ضرورت سے زائد مال ایک فالتو اور اضافی چیز کے زمرے میں آتا ہے۔ کسی بھی چیز کی زیادتی جماعتوں اور افراد کے لیے سب سے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ وقت کی زیادتی انسان کو بور کر دیتی ہے اور جب کئی کئی دن انسان کو فراغت مل جائے تو انسان کی جان پر بنی ہوتی ہے۔ شہوت کی زیادتی جبکہ اس کے لیے کوئی شرعی و دینی ضابطہ نہ ہو، تباہ کن بلا کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ انسان کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ دوسروں کی عزت وناموس سے کھیلے اور ایسے شخص کی زندگی فسق وفجور پر مبنی ہوتی ہے۔

ضرورت سے زائد مال انسان کے لیے ایک بوجھ ہوتا ہے، چاہے اسے اس کا احساس نہ ہو۔ یہ ایسے کہ جب وہ اپنے اضافی اور زائد مال کی حفاظت اور حساب کتاب میں پڑا ہوتا ہے تو اس وقت وہ پریشانی میں ہوتا ہے اور یہی اس کے لیے بوجھ ہے۔ بسا اوقات اسی مال کی فراوانی اور اس سے محبت انسان کے لیے دین ودنیا کی تباہی اور بربادی کا باعث بنتی ہے۔ آج ہمارے اس پر فتن دور میں دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس بات کی واضح دلیل ہے۔ اسلام کی دعوت اعتدال، میانہ روی اور قناعت پر مبنی ہے۔

اسلام فرد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے اضافی مال، وقت، جنس اور کھانے وغیرہ کے استعمال میں اسراف اور تبذیر سے دور رہے۔ بسیار خوری (Over eating) صحت کے لیے مضر ہے۔ جسم کا اندرونی نظام گڑبڑ ہو جاتا ہے اور انسان سست اور مدہوش نظر آتا ہے۔ عبادات میں زیادتی تعمیر کائنات سے دور بھاگنے کے مترادف ہے اور یوں بھی انسان اس طرح سے اللہ کی رضا حاصل نہیں کر سکتا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو منع کر دیا تھا جن کا ارادہ تھا کہ وہ اپنا سارا وقت اللہ کی عبادت میں گزاریں گے۔

گویا وہ محنت ومشقت سے پیچھا چھڑا کر ہمیشہ کا سکون چاہتے تھے۔ یا پھر وہ اس طرح اللہ تعالیٰ کا قرب چاہتے تھے۔ صحیحین میں اس واقعے کی تفصیل موجود ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تین آدمی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں دریافت کرنے کے لیے آئے۔

جب انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں آگاہ کیا گیا تو انھوں نے اپنی نظروں میں اسے معمولی سمجھا اور کہنے لگے: ہمارا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا مقابلہ! آپ کے تو پہلے پچھلے سب گناہ معاف ہیں، چنانچہ ان میں سے ایک نے کہا: ''میں جب تک زندہ ہوں رات کو عبادت ہی کروں گا، سوؤں گا نہیں۔''

دوسرے نے کہا:

''میں ہمیشہ روزے ہی رکھوں گا، کبھی چھوڑوں گا نہیں۔''

تیسرے نے کہا:

''میں عورتوں سے دور رہوں گا، کبھی شادی نہیں کروں گا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی باتوں کا پتا چلا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے اور فرمایا: ''تم نے یہ یہ باتیں کی ہیں؟ خبردار! میں تم سب سے زیادہ متقی اور اللہ سے ڈرنے والا ہوں لیکن میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا، رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔ سن لو! جس نے میری سنت سے منہ موڑا وہ مجھ سے نہیں۔''[1]

[1]صحيح البخاري، حديث: 5063، و صحيح مسلم، حديث: 1401-

سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی تاکہ آپ اس لشکر میں شامل ہو جائیں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی فتح کے لیے تیار کر رہے تھے اور جس کے ذریعے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کو بتوں کی نجاست سے پاک کرنا چاہتے تھے۔

ہجرت مدینہ کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے نظر آنے لگے۔ وہ تکبیرات اور تہلیلات بلند کرتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے، بتوں کو گراتے ہوئے اور کفر اور اہل کفر پر غلبہ پاتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے حتی کہ کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور کلمۂ توحید ان کی زبانوں پر تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے دروازے کے پاس ٹھہرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار یہ کلمات دہرا رہے تھے۔

((لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ، صَدَقَ وَعْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ، وَأَعَزَّ جُنْدَهُ، وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ))

''ایک اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔ اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی، اپنے لشکر کو عزت و شرف سے نوازا اور اس اکیلے نے تمام لشکروں کو شکست فاش دی، ایک اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں۔'' پس کون ہے وہ قائد اور لیڈر جو اس طرح کا کردار ادا کرے جیسا صہیب بن

سنان رضی اللہ عنہ نے کیا تھا؟ ہاں، وہ کون سا نیا راہنما ہے جو اپنے مال کو، اپنے عیال اور اپنی دنیا کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف ہجرت کرے گا اور ایمانی لشکر اور اللہ کے لشکروں کی تنظیم نو کرے گا؟ جی ہاں! ایسا کوئی ہے جو ان جو ارض اسلام کو آزادی دلائے اور کفر اور اس کے لشکر

کو واپس ان کے گھروں تک بھگا آئے؟

آپ کے خیال میں ایسا لیڈر کون ہو سکتا ہے؟

کس شہر اور کس خطے میں اس کا ظہور ہو سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ مسلمان اس وقت ایسے قائد کے انتظار میں ہیں اور اس ستارے کے طلوع ہونے کے منتظر ہیں۔

کیا یہ خواہش پوری ہوتی نظر آتی ہے؟

اور کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی؟

ہمیں اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ ایسے دن دوبارہ ضرور آئیں گے!!۔

تیسری آیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ، وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ﴾

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو پاکیزہ چیزیں تمھارے واسطے حلال کی ہیں ان کو حرام مت کرو اور حد سے آگے مت نکلو، بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تم کو دی ہیں ان میں سے حلال مرغوب چیزیں کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔" [1]

[1]المائدة 5: 87-88-

نزول آیات کے متعلق علماء کے اقوال

مفسرین، محدثین اور اہل سیر کی اکثریت کا قول ہے کہ یہ آیات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جن میں سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔

ملاحظہ کیجیے:

تفسیر الطبري: 10/520

تفسیر القرطبي: 6/260

الدر المنثور: 8/308

تفسیر بغوي والخازن: 2/70,69

جامع الترمذي: 3054

أسباب النزول للواحدي، ص: 199

عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ

والد کا نام مظعون بن حبیب جمحی تھا۔ تاریخ ان کے بارے میں خاموش ہے۔ زوجہ محترمہ کا نام خولہ بنت حکیم تھا اور یہ وہی خاتون ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہا تھا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں محسوس کررہی ہوں کہ آپ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد تنہائی محسوس کررہے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں! وہ میرے بچوں کی ماں تھی اور گھر کی دیکھ بھال کرنے والی خاتون تھی۔'' وہ کہنے لگیں: ''میں آپ کے لیے کسی سے رشتے کی بات کروں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیوں نہیں! ویسے تم عورتیں اس معاملے میں بہت نرم دل ہو۔'' چنانچہ انھوں نے سودہ بنت زمعہ اور عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہم کا ان کے گھر والوں سے رشتہ مانگا۔[1]

بھائیوں میں عبداللہ اور قدامہ کے نام آتے ہیں۔ جو سابقین اولین میں شامل ہیں، دونوں ہجرتوں (ہجرت حبشہ و ہجرت مدینہ) کا اعزاز انھیں حاصل ہے اور اللہ کے راستے میں جہاد بھی کرتے رہے۔

[1]الطبقات الکبریٰ:8/57۔

سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ اسلام سے قبل بھی سلیمُ الفطرت اور عقل و شعور کے مالک تھے۔ بتوں اور ان کی پوجا پاٹ سے یکسر دور تھے۔ جاہلیت کی عادات ان میں بالکل نہیں تھیں اور انھوں نے دور جاہلیت ہی میں اپنے اوپر شراب حرام کی ہوئی تھی۔ اور جب ان سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو ان کا جواب یہ تھا:

’’میں ایسی شراب نہیں پیتا جو میری عقل کو لے جائے اور جس کی وجہ سے مجھ پر گھٹیا لوگ بھی ہنسیں اور جو مجھے اس بات پر ابھارے کہ میں اپنی ماں سے برائی کر بیٹھوں۔‘‘

اور جب شراب کی حرمت نازل ہوئی تو ان سے کہا گیا:

’’عثمان! شراب حرام کر دی گئی ہے۔‘‘

تو انھوں نے یہ جواب دیا:

’’اس کے لیے ہلاکت ہو! مجھے اس کے بارے میں پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ یہ بہت ہی گھٹیا چیز ہے اور یہ ضرور حرام کر دی جائے گی۔

سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے دعوت اسلام سنتے ہی لبیک کہا اور داعیان اسلام میں شامل ہو گئے۔

طبقات ابن سعد میں مصنف لکھتے ہیں:

’’سیدنا عثمان بن مظعون، عبیدہ بن حارث، عبد الرحمن بن عوف، ابو سلمہ بن عبد الاسد اور ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم یہ سب اکٹھے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کیا تو یہ سب حضرات ایک ہی مجلس میں مسلمان ہو گئے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی دار ارقم میں منتقل نہیں ہوئے تھے اور نہ وہاں دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا تھا۔

ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر کے صحن میں تشریف فرما تھے کہ عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ وہاں سے گزرے، آپ نے انھیں آواز دی تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ اسی دوران میں جب باتیں ہو رہی تھیں تو اچانک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نظر مبارک آسمان کی طرف اٹھائی۔ نظر گھماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دائیں جانب زمین پر لے آئے، پھر وہاں سے اٹھ کر اس طرف چل دیے جہاں نظر آ کر ٹکی تھی، اس جگہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سر مبارک کو اس طرح گھما رہے تھے کہ گویا آپ کسی کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے اور وہ باتیں جو آپ سے کہی جا رہی تھیں آپ نے سمجھ لیں تو آپ نے دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا اور دیکھتے ہی رہے یہاں تک کہ آسمان میں نظر چھپ گئی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھی کے پاس واپس آ کر بیٹھ گئے۔

عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے عرض کی: حضور! میں پہلے بھی آپ کے پاس آتا رہتا ہوں اور کئی بار آپ کے ساتھ بیٹھنے کا موقع بھی ملا ہے لیکن آج جس طرح آپ نے کیا ہے پہلے کبھی نہیں دیکھنے میں آیا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''آپ نے کیا دیکھا ہے؟''

عثمان: میں نے آپ کو دیکھا ہے کہ آپ نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی ہے اور دور اپنی دائیں جانب دیکھا ہے، پھر آپ مجھے چھوڑ کر اس جانب چلے گئے ہیں۔ آپ اپنے سر کو ایسے حرکت دے رہے تھے گویا کوئی شخص آپ سے بات کر رہا ہو اور آپ اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

''کیا واقعی آپ نے یہ سب کچھ دیکھا ہے؟''عثمان: جی ہاں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''میرے پاس آپ کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ کا پیامبر آیا تھا۔''عثمان: ''اللہ کا پیامبر؟''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

''جی ہاں، اللہ تعالیٰ کا قاصد۔''

عثمان: ''اس نے آپ سے کیا کہا ہے؟''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

''اس نے آکر مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سنایا ہے:

﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَى وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ عدل کا، بھلائی کا اور قرابت داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی کے کاموں، ناشائستہ حرکتوں اور ظلم وزیادتی سے روکتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔[1]''

سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پس اس وقت سے میرے دل میں ایمان بھر گیا اور مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہو گئی۔ واقعتاً انھوں نے سچی محبت کی۔ ان کے دل میں آپ کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

جسم کا ہر حصہ آپ کی محبت سے سرشار تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہستی ہیں جن کے ذریعے سے انھیں ہدایت نصیب ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں صراطِ مستقیم سے متعارف کرایا۔ جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں سے ایمان کی روشنی میں

[1]الطبقات الکبریٰ:1/174، النحل16 :90۔

لے آئے، چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے اپنی اولاد، بیویوں، خاندان اور وطن سے بڑھ کر محبت کی تھی حتی کہ جب مشرکین نے مومنین کی جماعت کا جینا دوبھر کر دیا تو انھوں نے ہر چیز کو چھوڑ دیا اور اپنا دین بچاتے ہوئے حبشہ کو کوچ کر گئے۔

سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بھی انھی لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے خالصتاً اپنے دین کی حفاظت کے لیے گھر بار چھوڑا تھا اور پھر کافی عرصہ مہاجرین کے ساتھ ارض حبشہ میں نجاشی کی مہمان نوازی میں رہے۔ لیکن جب مشرکین نے یہ اعلان کیا کہ ہم اس نئی دعوت سے مصالحت کرنے کے لیے تیار ہیں اور انھوں نے مسلمانوں کے درپے ہونا چھوڑ دیا تو مہاجرین حبشہ اپنے آبائی شہر مکہ واپس آ گئے۔

تاہم وہ اپنی واپسی پر اس وقت نہایت ہی نادم ہوئے جب انھیں اس حقیقت کا علم ہوا کہ یہ سب قریش کی چال تھی اور وہ اس کے ذریعے سے مہاجرین حبشہ کو، جنہوں نے اپنے دین کی خاطر اپنے وطن کو خیر باد کہا تھا، دوبارہ قید کر کے انھیں تختہ مشق بنانا چاہتے تھے اور دوبارہ بتوں کی عبادت کرنے پر مجبور کرنا چاہتے تھے۔

اسی کے بارے میں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے چند اشعار کہے تھے جن میں انھوں نے امیہ بن خلف کو ڈانٹ پلائی جو انھیں اذیتیں پہنچایا کرتے تھا۔ آپ نے امیہ بن خلف کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "کیا تو ظلم کرتے ہوئے مجھے وادی مکہ سے نکال رہا ہے اور مجھے سفید محل میں رہنے پر مجبور کر کے گالیاں بک رہا ہے۔ تو تیروں کو پر لگاتا ہے اور تجھے یہ تیرا عمل موافق نہ آئے گا۔ تو جو تیر بناتا ہے اس کے سارے پر تیرے ہی لیے ہیں۔ تو نے ایسی قوم سے لڑائی مول لی ہے جو عزت دار ہیں اور ایسی قوم سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے جن کی تو پناہ لیتا تھا۔ عنقریب تجھے پتا چل جائے گا جب تجھ پر کوئی مصیبت آئے گی اور تجھے کمینے لوگ تیرے ہی کرتوتوں کے سپرد کر کے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے جائیں گے۔"[1]

اسی لیے جب سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے مکہ میں داخل ہونا چاہا تو ولید بن مغیرہ کا امان لینے پر مجبور ہو گئے اور پھر ولید کی پناہ ہی میں وہ کافی عرصہ امن و سکون کے ساتھ مکہ میں رہے۔ کسی نے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی اور نہ ہی ان کی طرف میلی نگاہ کے ساتھ دیکھا حالانکہ دوسرے مسلمان جو حبشہ سے واپس آئے تھے انھیں طرح طرح کی اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا چنانچہ جب عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے یہ صورت حال دیکھی تو انھیں اچھا نہ لگا، کہنے لگے:

"واللہ! میری صبح و شام تو مشرک آدمی کی پناہ کی وجہ سے محفوظ ہو اور میرے دوسرے بھائی آزمائش اور تکلیف میں مبتلا ہوں۔ یہ تو میرے لیے بڑے عیب کی بات ہے۔

" عثمان رضی اللہ عنہ ولید بن مغیرہ کے پاس گئے اور کہا: "اے عبد شمس! تیرا ذمہ پورا ہو گیا۔ اب میں تیری پناہ واپس کرتا ہوں۔" اس نے کہا: میرے بھتیجے! آخر کیوں؟ تجھے کسی نے تکلیف دی ہے یا تیری عزت پامال کی ہے؟ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں، میں اب صرف اپنے اللہ کی پناہ پر راضی رہنا چاہتا ہوں اور اس کے سوا کسی کی پناہ میں نہیں آنا چاہتا۔" اس پر ولید نے کہا: تجھے مسجد حرام میں جا کر لوگوں کے سامنے، جس طرح میں نے تجھے پناہ میں لیا تھا اس طرح، میری پناہ واپس کرنا ہو گی۔ دونوں مسجد حرام میں

[1]السيرة النبوية لابن ہشام:1،355۔

پہنچے۔ وہاں ولید نے کہا: اس نے سچ کہا۔ یہ واقعی مجھے میری پناہ واپس لوٹانے آیا ہے۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اس نے بھی سچ کہا ہے۔ میں نے اسے وفادار اور بہترین پناہ دینے والا پایا ہے لیکن اب میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی پناہ میں نہ رہوں، لہٰذا میں اب اس کی پناہ اسے واپس کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر عثمان رضی اللہ عنہ واپس لوٹ آئے۔[1]

یہ تھا عثمان رضی اللہ عنہ کا کردار۔ یقیناً آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے مصداق ہیں: ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔'' [2]

لہٰذا جب مسلمانوں کو کوئی اذیت پہنچے تو اس میں سب مسلمانوں کو شامل ہونا چاہیے۔ یہی وہ تعاون اور الفت و محبت ہے جو اسلام کے ہر اول دستے کو ممتاز کرتی ہے۔ یہ الفت و تعاون ہر میدان میں نمایاں تھی۔ جنگ ہوتی تو تلوار کا وار اپنے سینے پر کھا لیتے اور اپنے بھائی کی جان بچاتے۔ صفوں میں آگے آگے ہوتے تاکہ اپنے پچھلوں کو بچا سکیں۔ انتہائی بھوک میں بھی اپنے پیٹ کی آگ نہ بجھاتے بلکہ روٹی کے وہ ٹکڑے اپنے اس بھائی کو دیتے جو ان سے زیادہ بھوکا ہوتا۔ ان کے بارے میں شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے:

''جب وہ زرہ پوش ہو کر میدان جنگ میں اترتے ہیں تو قلعوں کے قلعے تباہ کر ڈالتے ہیں اور جب شام ہوتی ہے تو آپ انھیں اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز پاتے ہیں۔'' عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے ولید کا امان واپس لوٹا دیا اور بے خوف و ہراس مکہ کی

[1]السيرة النبوية لابن بشام:1/355- [2] صحيح البخاري، حديث: 13-

گلیوں اور بازاروں میں گھومنے لگے، گویا وہ مشرکین کو بھڑکا رہے تھے اور انھیں چیلنج کر رہے تھے۔ اچانک ان کی نظر لوگوں کے ایک جمگھٹے پر پڑی جو لبید بن ربیعہ شاعر کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے اور وہ انھیں اپنے اشعار پڑھ پڑھ سنا رہا تھا۔

عثمان رضی اللہ عنہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور بڑے غور سے سننے لگے۔ اشعار پڑھتے ہوئے لبید نے یہ الفاظ کہے:

اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَّا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٗ

''خبردار! اللہ کے علاوہ ہر چیز باطل ہے۔''

عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تونے سچی بات کہی ہے۔''

لبید نے اگلا مصرعہ پڑھا:

وَكُلُّ نَعِيْمٍ لَّا مَحَالَةَ زَائِلٗ

"اور ہر نعمت نے ایک دن ختم ہو جانا ہے۔" عثمان رضی اللہ عنہ نے ٹوکا: نہیں تو نے غلط کہا ہے۔ جنت کی نعمتیں کبھی زائل نہیں ہوں گی۔

لبید نے کہا: "اے قریش کی جماعت! اللہ کی قسم! آج سے پہلے کبھی تمھارے مہمان کو رسوا نہیں کیا گیا لیکن اب یہ کیسے ہوا؟" ان میں سے ایک آدمی نے کہا: "یہ اکیلا بے وقوف نہیں، اس کے ساتھ اور بھی ہیں جو ہمارے دین کو چھوڑ چکے ہیں۔ آپ اس کی باتوں کو محسوس نہ کرنا۔"

عثمان رضی اللہ عنہ سے صبر نہ ہو سکا اور انھوں نے اسے بھرپور جواب دیا۔ معاملہ بڑھ گیا، چنانچہ لڑائی میں اس آدمی نے عثمان رضی اللہ عنہ کی آنکھ پر طمانچہ مارا تو عثمان رضی اللہ عنہ کی آنکھ سوج گئی۔ ولید عثمان رضی اللہ عنہ کو قریب سے بیٹھا دیکھ رہا تھا، اس نے کہا: "اے میرے بھتیجے!

تیری یہ آنکھ اس چوٹ سے محفوظ تھی اور بلاشبہ تو ایک مضبوط پناہ گاہ میں تھا۔" عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: "واللہ! میری دوسری آنکھ بھی اللہ کے راستے میں چوٹ برداشت کرنے کی خواہش مند ہے۔ اے ابو عبد شمس! میں اس ذات کی پناہ میں ہوں جو تجھ سے زیادہ طاقت ور اور قدرت رکھنے والا ہے۔" ولید نے دوبارہ اپنی پناہ کی پیش کش کی جسے عثمان رضی اللہ عنہ نے ٹھکرا دیا۔" [1]

ولید چاہے ہزار بار آفر کرتا، وہ پھر بھی ٹھکرا دیتے کیونکہ وہ جان چکے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہیں جو موت وحیات کا مالک ہے اور رزق واجل بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ لوگ! یہ تو کسی چیز کے مالک ہیں نہ انھیں کوئی اختیار حاصل ہے۔ یہ تو خود اپنی جان کے مالک بھی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سچ کہا ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِنْ يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ ﴾

"اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے، لہٰذا تم اسے غور سے سنو، بے شک جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی ہرگز نہیں پیدا کر سکتے اگرچہ وہ (سارے ہی) اس کے لیے جمع ہو جائیں اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین لے تو وہ اسے بھی اس سے چھڑا نہیں سکتے، طالب ومطلوب (عابد ومعبود دونوں) کمزور ہیں۔" [2]

سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بے خوف پھرتے تھے اور کفار کے سامنے ایسی باتیں کرتے تھے جن سے ان کو غصہ آتا اور ان کے سینے میں آگ بھڑک اٹھتی۔ آپ ان کے سامنے کلمۂ توحید کو بلند کرتے اور حق کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی

[1]السيرة النبوية لابن ہشام: 1/391- [2] السيرة النبوية لابن ہشام:1/391، والحج 22 :73-

ہرگز پروا نہ کرتے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔

مسلمان اس نئی پناہ گاہ کی گھاٹیوں سے نکل کر چاروں طرف پھیل جاتے۔ اللہ کے دین کی دعوت دیتے، اس کے کلمے کی سربلندی کے لیے جہاد کرتے اور امن وسلامتی کا پیغام لے کر پھیل جاتے۔ اس نئی پناہ گاہ کو خود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے منتخب کیا تھا۔

عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس ہی میں رہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور ابو الہیثم بن تیہان کے درمیان اسلامی بھائی چارہ قائم کیا۔ طبقات میں ابن سعد ابو الہیثم رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ابو الہیثم دورِ جاہلیت میں بھی بتوں کو ناپسند کرتے تھے اور انھیں ان سے گھن آتی تھی اور وہ اس وقت بھی توحید کے قائل تھے۔ وہ انصار میں سے سب سے پہلے مکہ میں اسلام لائے۔ آپ کا شمار ان آٹھ افراد میں ہوتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی قوم سے پہلے ایمان لائے۔ مکہ میں اسلام قبول کر کے مدینہ آئے اور پھر یہیں اپنے اسلام کا اعلان کیا۔''[1]

عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نہایت باحیا اور شرمیلے تھے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''بے شک عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بہت ہی شرم و حیا والے ہیں۔'' [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا ہے: ''حیا ایمان کا حصہ ہے''[3] اور جو لوگ بے حیا ہوتے ہیں ان میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔

[1]الطبقات الکبرٰی:3؍448- [2] الطبقات الکبرٰی:3؍493- [3] سنن النسائي، حديث: 5006-

سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بہت سے اوصاف جمیلہ کے مالک تھے۔ آپ نہایت عبادت گزار اور زاہد انسان تھے۔ آپ کا اکثر وقت رب تعالیٰ کا تقرب اور اس کی رضا حاصل کرنے میں گزرتا، اگرچہ مطلوب یہی ہے کہ انسان اپنے رب کی رضامندی حاصل کرے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان راہبانہ زندگی گذارے اور دنیا اور دنیا والوں سے کٹ جائے اور تعمیر کائنات میں کوئی کردار ادا نہ کرے اور نہ انسانیت کی بھلائی کا کام کرے۔ ضروری ہے کہ انسان کے ذہن میں یہ بات رہے کہ ہر وہ کام جس کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہو وہ عبادت ہے اور آدمی اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔

ابو اسحاق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے پاس آئیں تو انھوں نے اسے نہایت ہی پراگندہ حالت میں دیکھا۔ امہات المومنین نے اس سے پوچھا: ''تجھے کیا ہوا ہے؟ قریش میں کوئی اتنا مال دار نہیں ہے جتنا آپ کا خاوند ہے۔''

انھوں نے کہا: ''اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ رات حالت قیام میں اور دن روزے کی حالت میں گزارتی ہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ کو اس صورت حال سے آگاہ کیا گیا۔ بعد میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان سے ملاقات ہوئی تو آپ نے سرزنش کرتے ہوئے فرمایا: ''کیا میں تمھارے لیے نمونہ نہیں ہوں؟''

[1]الطبقات الکبرىٰ:3؍395-

کا تقرب حاصل نہ کیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیے ہیں اور اپنی کتاب میں بیان فرمائے ہیں۔

سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر کے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ سیدہ ام العلاء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ ہمارے گھر میں بیمار ہوئے، ہم نے ان کی دیکھ بھال کی اور جب فوت ہوگئے تو ہم نے کفن پہنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں نے کہا: "ابو السائب! تمھیں جنت مبارک ہو۔"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تجھے کیسے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس طرح عزت افزائی فرمائی ہے؟" میں نے کہا: "میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! میں نہیں جانتی، اللہ کے رسول! آپ بتایے کہ ان کے ساتھ کیسا سلوک ہوا ہے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ فوت ہو چکے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ بھلائی والا معاملہ فرمائیں گے۔ میں اللہ کا رسول ہوں لیکن اس کے باوجود یہ نہیں جانتا کہ کل قیامت کے روز میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔" فرمانے لگیں: "میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! کیا آپ بھی؟ اللہ کی قسم! آج کے بعد میں کسی کے بارے میں ایسا نہیں کہوں گی۔"

وہ مزید فرماتی ہیں: "جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی تو مجھے دکھ ہوا۔ جب میں رات کو سوئی تو میں نے خواب میں دیکھا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک جاری چشمہ ہے۔ میں نے یہ خواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ اس کا عمل ہے۔" [1]
سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

[1]الطبقات الکبریٰ:3،398، و صحیح البخاري، حدیث:3929۔

"سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ اپنی طبعی موت فوت ہوئے اور شہادت سے سرفراز نہیں ہوئے تو میرے دل میں ان کے بارے میں میرے جذبات کافی حد تک تبدیل ہوگئے۔ میں نے اپنے دل میں کہا: "انھیں دیکھو تو ہم سب سے زیادہ دنیا سے بے رغبت تھے لیکن موت بستر پر آئی ہے اور شہید نہیں ہوئے۔" عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ قدر و منزلت میرے دل ہی میں رہی یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہوئے۔ تب میں نے اپنے آپ سے کہا: تیری بربادی ہو! افضل ترین لوگ بھی تو بستر پر فوت ہوتے ہیں، پھر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی طبعی موت فوت ہوئے تو میں نے پھر کہا: تجھ پر افسوس ہو! تجھ سے بہتر لوگ بھی بستر پر فوت ہوتے ہیں، چنانچہ میرے دل میں عثمان رضی اللہ عنہ کا وہی مقام پیدا ہو گیا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔" [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فوت ہونے والے صحابہ کے لیے قبرستان کی جگہ تلاش کر رہے تھے، اس مقصد کے لیے آپ ایک مرتبہ مدینہ اور اس کے اطراف و اکناف میں گئے۔ ایک جگہ رک کر آپ نے فرمایا: "مجھے اس جگہ کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ آپ نے بقیع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔" مذکورہ قبرستان میں سب سے پہلے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو دفن کیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قبر پر سر کے برابر ایک پتھر رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"یہ ہمارے پیش رو ہیں۔"

چنانچہ بعد میں جو شخص بھی فوت ہو تا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا جاتا کہ اسے

[1]الطبقات الکبریٰ:3/399۔

کہاں دفن کرنا ہے تو آپ فرماتے: "ہمارے پیش رو عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے قریب۔" عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات کے تھوڑے عرصے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لخت جگر سیدہ زینب رضی اللہ عنہا فوت ہوئیں تو آپ نے فرمایا:

"اے میری بیٹی! ہمارے بہترین ساتھی عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی مصاحبت میں چلی جا۔"

یزید بن ہارون نے اپنی حدیث میں کہا: عورتیں رونے لگیں تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ انھیں کوڑے کے ساتھ مارنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: "عمر رک جاؤ۔" پھر عورتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: "تمھیں رونے کی اجازت ہے لیکن شیطان کی طرح آوازیں مت نکالنا۔" [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان برحق ہے۔ محبوب اور پیاروں کی جدائی پر آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں اور دل خون کے آنسو روتا ہے۔ حقیقت میں انسان احساسات اور جذبات کا مجموعہ ہے۔ وہ اپنی طبیعت کے اعتبار سے معاشرت پسند ہے، مل جل کر رہنے میں اسے اطمینان اور راحت محسوس ہوتی ہے۔ ہر ذی روح کا انجام آخر موت ہے اور ہر ایک کا وقت مقرر ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا حتی کہ وہ لوگ بھی جن کے دلوں کو بسبب ان کے گناہوں کے اللہ تعالیٰ نے بگاڑ دیا ہے۔

اب نہ تو وہ حق کو قبول کرتے ہیں اور نہ نور ایمان کی انھیں کچھ معرفت حاصل ہے۔ ایک اچھا انسان اپنے محبوب کی مفارقت اور جدائی پر ضرور رنجیدہ ہوتا ہے اور یہ تصور کہ وہ اب دوبارہ اس دنیا میں اپنے محبوب کو نہیں دیکھ سکے گا، اسے رلا دیتا ہے۔

[1]الطبقات الکبریٰ:3/399۔

اس کے برعکس وہ انسان جس کا دل جامد ہو چکا ہو اس کے اندر احساسات و جذبات نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ اسے نہ تو کسی سے محبت و شفقت ہوتی ہے اور نہ کسی کی جدائی پر غم ہوتا ہے اور نہ آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ ایسے انسان جانداروں سے زیادہ جمادات کے مشابہہ ہوتے ہیں اور شیطان کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔

جن لوگوں کا اپنے رب پر ایمان ہے اور وہ اس کی کتابوں اور رسولوں کی تصدیق بھی کرتے ہیں وہ روز قیامت ایسی اعلیٰ جنت میں ہوں گے جس کی چوڑائی زمین و آسمان کے برابر ہے۔ یہ جنت متقین کے لیے تیار کی گئی ہے۔

لیکن...... غم فراق کتنا دشوار ہوتا ہے...... اور سفر آخرت کتنا لمبا ہے... ... اور جدائی کا ذائقہ کتنا کڑوا ہوتا ہے۔

اسباب نزول

سعید بن مسیب رحمہ اللہ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو ترک دنیا کی اجازت نہیں دی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اجازت مرحمت فرماتے تو وہ اپنے آپ کو خصی کر لیتے۔ عائشہ اپنے باپ قدامہ سے، وہ اپنے بھائی عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یارسول اللہ! جنگوں میں بیوی سے دور رہنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔

کیا آپ اجازت دیں گے، میں خود کو خصی کر لوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نہیں، میں تمھیں خصی ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ ابن مظعون! روزے رکھا کرو، اس سے شہوت میں کمی آتی ہے۔“[1]

جامع ترمذی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کرنے لگا: اے اللہ کے رسول! جب میں گوشت کھالوں تو میری شہوت بہت بڑھ جاتی ہے، اس لیے میں نے خود پر گوشت کو حرام کر لیا ہے۔[2]

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت نازل فرمائی:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللهُ لَكُمْ﴾

[1]معجم الصحابة لابی القاسم، حديث:4/146،حديث: 1792- [2] جامع الترمذي، حديث: 3054-

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال کی ہیں ان کو حرام مت کرو۔“[1]

مفسرین کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وعظ ونصیحت کی اور قیامت کی ہولناکیوں سے آگاہ کیا۔ اس دن آپ نے صرف جہنم سے ڈرایا۔ جنت کی نعمتوں کا تذکرہ نہ کیا۔ لوگوں پر رقت طاری ہو گئی اور وہ رونے لگے، چنانچہ دس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے گھر میں جمع ہوئے جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

1۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ 2۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

3۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ 4۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما

5۔ سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ 6۔ سیدنا سالم مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ

7 سیدنا مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ 8 سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

9سیدنا معقل بن مقرن رضی اللہ عنہ 10۔سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ

مذکورہ دس افراد جمع ہوئے اور انھوں نے اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ آج کے بعد وہ دن کو روزہ رکھیں گے، رات کو قیام کریں گے اور سوئیں گے نہیں۔ گوشت نہیں پکائیں گے اور نہ ہی چربی استعمال کریں گے۔ عورتوں کے قریب نہیں جائیں گے، خوشبو استعمال نہیں کریں گے، کھردرے کپڑے پہنیں گے، دنیا کو چھٹک دیں گے، زمین میں پھیل جائیں گے، راہبانہ زندگی اختیار کریں گے اور مجالس ذکر کو پسند کریں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی خبر ہوئی تو آپ نے ان سب کو بلایا اور پوچھا:

[1]المائدة 5:87۔

''ہمیں خبر ملی ہے کہ آپ لوگوں نے یہ باتیں کی ہیں۔''

انھوں نے عرض کی: جی ہاں، آپ کو درست خبر ملی ہے، ہمارا صرف خیر کا ارادہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے ان باتوں کا حکم نہیں ملا، خبردار! تمھاری جانوں کا تم پر حق ہے، روزے ضرور رکھو لیکن وقفے کے ساتھ، رات کو قیام کرو لیکن نیند بھی کرو، مجھے دیکھو، میں قیام اللیل بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ روزہ رکھتا بھی ہوں لیکن بعض اوقات نہیں بھی رکھتا۔ میں گوشت اور چکنائی بھی استعمال کرتا ہوں، سن لو! جس نے میری سنت سے اعراض کیا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔''

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے لوگوں کے پاس آئے اور خطبہ ارشاد فرمایا:

''لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انھوں نے اپنے آپ پر عورتیں، کھانا، خوشبو، نیند اور دنیا کی خواہشات کو حرام کر لیا ہے، خبردار! میں تمھیں پادری اور راہب بننے کا حکم نہیں دیتا۔ میرے دین میں عورتیں اور گوشت چھوڑنے کی کوئی گنجائش نہیں، چرچ بنانا بھی میری شریعت میں نہیں۔ میری امت کی سیاحت روزہ ہے اور رہبانیت جہاد ہے۔ صرف اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کرو، اس کے ساتھ شرک نہ کرو، حج اور عمرہ کرو، نماز کو قائم کرو اور زکاۃ پابندی سے ادا کرو۔ رمضان کے روزے رکھو، تم سے پہلی امتیں اسی تشدد کی وجہ سے ہلاک ہوئی تھیں۔ جب انھوں نے اپنے آپ پر سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر اسی طرح سختی ڈال دی، پس ان معبد خانوں اور چرچوں میں (ابھی تک) انھی لوگوں میں سے باقی ماندہ ہیں۔''

اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت نازل فرمائی:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللهُ لَكُمْ﴾

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال کی ہیں ان کو حرام مت کرو۔'' [1]

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مذکورہ دس حضرات نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! اب ہماری ان قسموں کا کیا بنے گا؟

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت نازل فرمائی:

﴿ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْأَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ذَلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾

''اللہ تمھاری بلا ارادہ قسموں پر تمھیں نہیں پکڑے گا لیکن ان قسموں پر ضرور پکڑے گا جو تم نے مضبوط باندھ لیں، چنانچہ اس کا کفارہ دس مسکینوں کو درمیانے درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو یا انھیں کپڑے پہنانا ہے یا ایک گردن (غلام) آزاد کرانا ہے، پھر جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے تین دن کے روزے رکھنا ہے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھا (کر توڑ) بیٹھو اور تم اپنی قسموں کی حفاظت کرو، اللہ اسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔'' [2]

[1]المائدة 5:87- [2] المائدة 5:89-

ضمیمہ

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عبادت صرف نماز ادا کرنے، روزہ رکھنے، حج ادا کرنے اور بعض دیگر نوافل وواجبات ادا کرنے کا نام ہے، چنانچہ ان کے نزدیک جب انسان ان ارکین خمسہ پر مواظبت کرے تو گویا اس نے اپنی عزت اور خون محفوظ کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ عبادات ارکان اسلام میں سے ہیں، ان میں سے کسی ایک کا انکار یا جان بوجھ کر چھوڑنا اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے۔ اسلام میں عبادت کا حقیقی تصور اس سے کہیں بڑا اور محیط ہے۔ انسان زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب ہے۔

جنت سے اسی لیے اتارا گیا تھا کہ اس کائنات کو آباد کرے اور زندگی کی حرکت کو باقی رکھے۔ اور انسان سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ہر عمل سے اور ہر پیشے سے، جسے بھی وہ اپنائے، اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی حاصل کرے۔

جب انسان یہ کام اس تصور سے کرے گا تو یہ بھی عبادت شمار ہو گی۔ وہ طالبان علم جو اپنے مدارس اور مساجد میں بیٹھے علم حاصل کرتے ہیں اور علمی نظریات اور افکار کے ذریعے سے تعمیر کائنات کی کوشش کرتے ہیں اور زندگی کی گاڑی کا پہیہ آگے کو دھکیلتے ہیں وہ عبادت ہی میں مشغول ہوتے ہیں ، فرشتوں نے ان کو ڈھانپا ہوتا ہے اور ان پر سکینت نازل ہو رہی ہوتی ہے۔

فرمان نبوی ہے:

"جو لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں بیٹھ کر علم حاصل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں، اللہ کی رحمت ان پر سایہ فگن ہوتی ہے، ان پر سکینت نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ فرشتوں میں ان کا تذکرہ کرتا ہے۔"[1]

اسی طرح وہ کسان جو صبح سویرے اپنے کھیت کی طرف جاتا ہے، اس کی دیکھ بھال کرتا ہے، کھاد پانی دیتا ہے، یہ سب کام عبادت ہیں اور ایسا انسان اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہے۔ ارشاد نبوی ہے: "وہ مسلمان جو کوئی درخت لگاتا ہے یا کھیتی کاشت کرتا ہے پھر اس سے پرندے، انسان اور دوسرے جانور کھاتے ہیں تو یہ اس کی طرف سے صدقہ ہوتا ہے۔" [2]

اسی طرح وہ شخص جو اپنے کارخانے میں بیٹھ کر آلات تیار کرتا ہے، اپنی مشینوں کو حرکت دیتا ہے اور پھر انھی آلات کو انسان کے آرام اور فلاح وبہبود کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے تو اس کا یہ عمل عبادت ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہوتا ہے۔ روایت کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہاتھ کا بوسہ لیا جو کثرت سے کام کی وجہ سے سوج چکا تھا اور آپ نے فرمایا:

"یہ وہ ہاتھ ہے جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول محبت کرتے ہیں۔" [3]

اسی پر ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ زمین کی سیر وسیاحت، آسمانوں کے عجائبات کی

[1]جامع الترمذي، حديث: 3380- [2] صحيح البخاري، حديث: 2320- [3] تفسير الشعراوي، الكهف: 33-

جستجو، ستاروں اور کہکشاؤں پر کمند ڈالنا، بیماروں کے علاج کے لیے ادویات دریافت کرنا، بیماریوں اور جراثیم پر ریسرچ کرنا تاکہ انھیں ختم کیا جا سکے اور انسانیت کو ان کے مضر اثرات سے بچایا جا سکے۔ اگر یہ سب کام محض اللہ کی رضا کے لیے سر انجام دیے جائیں تو یہ بھی عبادت کے زمرے میں آتے ہیں۔

اسی طرح اسلامی ریاست کی حفاظت کے لیے اس کی سرحدوں پر پہرہ دینا تاکہ حملہ آوروں سے اپنی قوم کی جان کی حفاظت ممکن ہو اور دشمن کی سازشوں کو ناکام بنا دیا جائے تو یہ بھی عبادت ہے اور ایسے شخص کے لیے جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان گرامی ہے: "دو آنکھیں ایسی ہیں جنھیں آگ نہیں چھو سکے گی۔ ایک وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روئی اور دوسری وہ جو اللہ کے راستے میں پہرہ دیتی ہے۔"[1]

جب صورت حال یہ ہے تو اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور نہ ہی سستی اور کاہلی کی کوئی جگہ باقی رہتی ہے۔ اسلام عمل پیہم کا نام ہے جس کے ذریعے سے تعمیر کائنات ممکن ہو سکے اور انسان زمین میں اپنی خلافت صحیح معنوں میں ثابت کر سکے۔ کسی بھی فرد کے لیے یہ قطعاً مناسب نہیں کہ اس پر جتنی نمازیں اور جتنے روزے مشروع ہیں ان سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے جبکہ نفلی عبادت اسے اس کے ذاتی کام اور دیگر واجبات سے مشغول کر رہی ہو۔

اسی طرح کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے اوپر کسی چیز کو حلال یا حرام کر

[1]جامع الترمذي، حديث: 1639.

دے یا کسی عمل کو اپنے اوپر لاگو کر دے یا اسے ترک کر دے۔ یہ سب کام اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات سے ہیں کیونکہ یہ اللہ ہی ہے جو پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتا ہے، اس لیے کسی انسان کے لیے لائق نہیں کہ وہ ان طیبات کو، جو اس کے لیے اور اس کی زندگی کے لیے مفید ہیں، حرام ٹھہرائے، اس لیے کہ زندگی اور حیات کے بارے میں اس کی بصیرت اس کنہ اور تہہ تک نہیں پہنچ سکتی جہاں اس حکیم و بصیر کی بصیرت پہنچ سکتی ہے جس نے ان پاکیزہ اشیا کو حلال کیا ہے۔ اگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان اشیا میں کوئی شر یا نقصان جانتا تو اپنے بندوں کو ان سے ضرور بچاتا اور اگر ان کے حرام کرنے میں کوئی خیر ہوتی تو وہ انھیں قطعاً حلال نہ کرتا۔

یہ دین تو آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ تمام انسانیت کے لیے ہر قسم کی بھلائی اور خیر، مناسب توازن و تناسق کو ثابت کرے، چنانچہ اسلام انسان کی فطری حاجات اور خواہشات کو بالکل نہیں دباتا اور یہی وجہ ہے کہ اسلام رہبانیت کے مخالف ہے کیونکہ رہبانیت فطرت کو دبانے اور مسخ کرنے کا نام ہے۔ رہبانیت طاقت کو موقوف کرنے اور زندگی کے نمو کو روکنے کا نام ہے جبکہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا، اس لیے اللہ تعالی نے ہر قسم کی پاکیزہ چیزوں کو حرام کرنے سے روکا ہے کیونکہ یہ سب چیزیں زندگی کی افزائش اور اس کی تجدید کے عوامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ زندگی اس لیے پیدا کی ہے تاکہ اس میں بڑھوتری اور تجدد پیدا ہو اور اللہ تعالیٰ کے منہج کے ماتحت رہتے ہوئے ترقی پائے۔ رہبانیت اختیار کرنا اور طیبات کو حرام کرنا اللہ تعالیٰ کے اس منہج کے خلاف ہے جو اس کا زندگی کے بارے میں ہے کیونکہ رہبانیت میں زندگی ایک نکتے پر جا کر رک جاتی ہے جبکہ اسلام ترقی، بڑھوتری اور ارتقاع کو چاہتا ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کا منہج ہے۔ اور یہی عین فطرت کے موافق ہے۔ کائنات کی آبادکاری اور زندگی کی گاڑی کو آسان تر کرنا اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ بہت سے کاموں میں شرکت فرمایا کرتے تھے چنانچہ جب مسلمانوں نے محسوس کیا کہ کافر جمع ہو کر مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے اپنے دفاع کے لیے مدینہ منورہ کے ارد گرد خندق کھودی۔ خندق کی کھدائی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حصہ لیا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ خندق کی کھدائی والے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مٹی نکال رہے تھے اور آپ کا جسم مٹی سے غبار آلود تھا اور آپ فرمار ہے تھے: ''اللہ کی قسم! اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو ہمیں ہدایت نہ ملتی، نہ ہم صدقہ کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔ اے اللہ! تو ہم پر سکینت نازل فرما اور دشمن سے مقابلے کے وقت ہمیں ثابت قدم رکھ۔ کفار نے ہمارے خلاف جنگ مول لی ہے جب یہ کوئی فتنہ چاہتے ہیں تو ہم ان کی نہیں مانتے۔'' [1]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مہاجرین اور انصار خندق کھود رہے تھے اور اپنی کمروں پر مٹی ڈھو ڈھو کر باہر پھینک رہے تھے، اس وقت وہ کہتے جا رہے تھے: ''ہم وہ لوگ ہیں جنھوں نے محمد سے مرتے دم تک اسلام کے لیے بیعت کی ہے۔'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں ان الفاظ میں جواب دے رہے تھے: ''اصل بھلائی تو آخرت کی بھلائی ہے۔ اے اللہ! تو انصار اور مہاجرین کو برکت عطا فرما۔'' [2]

[1]صحيح البخاري، حديث: 4104۔ [2] صحيح البخاري، حديث: 2835۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ مزید فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے بڑھ کر بہادر اور دلیر تھے۔ ایک دفعہ اہل مدینہ کسی آواز کی وجہ سے گھبرا گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے اس جگہ سے ہو کر آئے، آپ ایک گھوڑے پر سوار تھے، آپ نے واپس آکر فرمایا: بھئی! ہم نے تو اس گھوڑے کو سمندر کی طرح پایا ہے (یعنی بہت تیز رفتار ہے)۔" [1]

ہم ایک نظر سیدنا عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی زندگی پر ڈالتے ہیں۔ انھوں نے پاکیزہ اور طیبات کو اپنی ذات پر حرام کر دیا تھا۔ دین کے بارے میں نہایت سختی اختیار کر لی تھی دن کو روزہ رکھتے اور رات مصلے پر گزارتے۔ اس عمل کا ان کی بیوی پر منفی اثر ہوا۔ ہوا یہ کہ ان کی بیوی نے دنیا کی زیب و زینت ترک کر دی اور جس طرح بیویاں اپنے خاوندوں کے لیے کشش پیدا کرنے کے لیے خوشبو لگاتی ہیں، میک اپ کرتی ہیں اور حسین و جمیل بنتی ہیں، یہ چیزیں انھوں نے چھوڑ دیں حتی کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے بھی اسے محسوس کر لیا، چنانچہ انھوں نے اسے ملامت کیا اور تنبیہ کی کہ بناؤ سنگھار میں اس طرح کی سستی اچھی نہیں ہوتی۔

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی بیوی اس موقع پر بہت سے بہانے بنا سکتی تھی، مثلاً: گھر کے کام بہت ہوتے ہیں، بچوں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے۔ لیکن اس ایماندار اور صابرہ خاتون نے امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے سامنے حقیقت بیان کر دی اور اپنا عذر پیش کر دیا کہ کس وجہ سے وہ میک اپ وغیرہ نہیں کرتیں، انھوں نے کہا:

[1]صحيح مسلم، حديث: 2307، و صحيح البخاري، حديث: 2908۔

"میں کس کے لیے میک اپ کروں؟ عثمان دن کو روزہ رکھتے ہیں اور رات کو مصلے پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔" واقعی اگر خاوند کے لیے نہیں تو پھر کس کے لیے میک اپ کیا جانا چاہیے؟ عثمان رضی اللہ عنہ نے تو دین اور عبادت کے معاملے میں شدت اختیار کر رکھی تھی جبکہ آج لوگوں کی اکثریت مال و دولت کی حرص اور ہوس کی وجہ سے اپنے واجبات سے بیگانہ ہے، وہ اپنے بیوی بچوں کو کم ہی وقت دیتے ہیں بلکہ کوئی اہمیت نہیں دیتے اور سمجھتے ہیں کہ جب وہ ان کے لیے کھانا پینا، لباس اور دوسری ضروریات زندگی مہیا کر رہے ہیں تو گویا وہ بیویوں کے حقوق ادا کر رہے ہیں۔ بیوی کے بارے میں یہ سستی اور مشغولیت بسا اوقات بہت سے نقصانات کا موجب بنتی ہے۔ ان میں سے ایک نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ بیوی صرف اپنے ہی لیے جیتی ہے یا پھر ایسا آدمی تلاش کرتی ہے جو اس کی طرف مائل ہو۔ ہمارے اس مخلوط اور آزاد معاشرے میں مؤخر الذکر نقصان کے زیادہ امکان ہیں۔

یا پھر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا بھی خیال نہیں رکھتی۔ گھر میں وہ ایک مردہ چیز کی طرح ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے گھر کی رونق اور خوبصورتی جاتی رہتی ہے۔ خاوند حضرات اس حقیقت کو کب سمجھیں گے؟ اپنے آپ کو مصروف ترین سمجھنے والے شوہر کب اس بات کی طرف توجہ دیں گے کہ ان کی خوشیاں اور رونقیں واپس آسکیں اور ہر بیوی اپنے ہی خاوند کے لیے میک اپ کرے۔ اور ہم بیویوں کی آنکھوں میں خوشی اور مسرت محسوس کریں اور ہر بیوی کی زبان پر وہ کلمہ جاری ہو جو عثمان رضی اللہ عنہ کے توجہ دینے کے حوالے سے ان کی زوجہ محترمہ نے بولا تھا:

"اب ہمیں بھی وہ مقام مل گیا ہے جو دوسروں کو حاصل ہے۔"

آیات کی شانِ نزول سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں: ایک شخص، جنھیں مرثد بن ابو مرثد رضی اللہ عنہما کہا جاتا تھا، مکہ سے مسلمان قیدی اٹھا کر مدینہ لایا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں: مکہ میں عناق نام کی ایک بدکار عورت رہتی تھی۔ قبل از اسلام مجھ سے اس کی دوستی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے مکہ میں کسی مسلمان قیدی سے وعدہ کیا کہ میں اسے لینے آؤں گا۔ میں وعدے کے مطابق مکہ آیا اور چاندنی رات میں ایک دیوار کے سائے میں کھڑا تھا کہ عناق آگئی۔ دیوار کے ساتھ سایہ محسوس کر کے ذرا قریب ہوئی تو اس نے مجھے پہچان لیا اور کہا: مرثد ہو؟ میں نے جواب دیا: ہاں، مرثد ہوں۔ عناق نے کہا: مرحبا، خوش آمدید، آؤ اور رات میرے ساتھ بسر کرو۔ میں نے کہا: عناق! اللہ تعالیٰ نے زنا حرام قرار دیا ہے۔

یہ سن کر اس نے شور مچا دیا: مکہ والو! یہ شخص تمھارے قیدی اٹھاتا ہے۔ میں نے وہاں سے دوڑ لگا دی تو میرے پیچھے آٹھ آدمی لگ گئے۔ میں خندمہ کے پہاڑوں کی طرف بھاگنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے میں ایک غار یا گڑھے میں داخل ہو گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے پہنچ گئے تھے۔ اللہ نے انھیں اندھا کر دیا تھا، وہ مجھے دیکھ نہ سکے۔ ان میں سے کسی نے پیشاب کیا تو وہ میرے سر پر گرا۔ تھوڑی دیر تلاش کرنے کے بعد وہ واپس چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں بھی اپنے ساتھی کے پاس آیا۔ اسے اٹھا کر اذخر مقام پر لے آیا۔ یہ آدمی بھاری بھر کم تھا۔ میں نے اس کی لوہے کی بیڑیاں کھولیں اور پھر میں اسے مدینہ لے آیا۔ اس کے وزنی پن نے مجھے خاصا تھکا دیا تھا۔

میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے درخواست کی: اللہ کے رسول! کیا میں عناق سے شادی کر لوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دیر خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا حتی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرما دیا:

﴿الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ﴾

''زانی مرد نکاح نہیں کرتا مگر زانیہ یا مشرکہ عورت ہی سے اور زانیہ عورت سے نکاح نہیں کرتا مگر زانی یا مشرک مرد ہی۔'' [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرثد رضی اللہ عنہ کو سورۂ نور کی آیت تلاوت کر کے سنائی اور فرمایا: ((فَلَا تَنْكِحْهَا)) ''تو اس سے نکاح نہ کر۔'' [2]
سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جب مرثد اور عاصم رضی اللہ عنہما شہید ہو گئے تو منافقین نے باتیں بنانی شروع کر دیں۔ کہنے لگے: ان جان کے دشمنوں پر افسوس! انھوں نے کیسی بے مقصد جانیں دی ہیں، نہ انھوں نے گھر میں آرام کیا اور نہ اپنے نبی کا پیغام پہنچا سکے۔ ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کیں:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللهَ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ۔ وَإِذَا تَوَلَّى سَعَى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾

[1]تفسير البغوي، والدر المنثور في التفسير، النور 24:3- [2] جامع الترمذي، حديث: 3177، وسنن أبي داود، حديث: 2051-

"اور (اے نبی!) لوگوں میں کوئی تو ایسا ہے کہ آپ کو اس کی بات دنیا کی زندگی میں بہت بھلی لگتی ہے اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس پر وہ اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔ اور جب وہ پلٹتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے کھیتوں اور نسل کو تباہ کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔" [1]

سریہ عاصم، یعنی حادثہ رجیع کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللهِ وَاللهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ﴾

" اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو (اس کے ہاتھ) بیچ ڈالتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر بہت شفیق ہے۔" [2]

امام ابوداود رحمہ اللہ نے یہ قصہ اختصار سے بیان کیا ہے۔ مرثد بن ابو مرثد غنوی رحمہ اللہ مکہ سے مسلمان قیدی اٹھایا کرتے تھے۔ مکہ میں ایک عناق نامی زانیہ عورت تھی جو مرثد رضی اللہ عنہ کی دوست رہ چکی تھی۔ مرثد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: اللہ کے رسول! کیا میں عناق سے نکاح کرسکتا ہوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے حتیٰ کہ آیت نازل ہوگئی:

﴿الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً﴾

"زانیہ عورت سے نکاح نہیں کرتا مگر زانی یا مشرک مرد ہی۔" [3]

[1]الدر المنثور في التفسير، وتفسير الطبري، البقرة 2:205,204- [2] الدر المنثور في التفسير، و تفسير الطبري، البقرة 2:207- [3]النور 3:24-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر قرآن کی آیت تلاوت کی اور فرمایا: اس سے نکاح نہ کرو۔" [1]

امام نسائی رحمہ اللہ نے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ان آیات کی شان نزول کسی دوسری عورت کے حوالے سے بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں: ام مہزول نامی ایک بدکار عورت تھی اور وہ بدکاری کا پیشہ کرتی تھی۔ صحابہ میں سے کسی نے اس سے شادی کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور کی مذکورہ آیات نازل فرمادیں۔[2]

سعید بن منصور نے مجاہد سے بیان کیا ہے، انھوں نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے زنا کی حرمت کا حکم نازل فرمایا تو کچھ لوگوں کے پاس زانی عورتیں تھیں اور وہ خوبصورت بھی تھیں۔ ان لوگوں نے کہا: انھیں ایک دفعہ طلاق دیکر دوبارہ انھی عورتوں سے نکاح کرلیں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمادیں۔[3]

[1]سنن أبي داود، حديث: 2051، و جامع الترمذي، حديث: 3176- [2] سنن النسائي الكبرىٰ، حديث: 11359- [3] تفسيرجلالين، النور 3:24، و سنن الكبرى للبيهقي:153،7-

”اور (اے نبی!)لوگوں میں کوئی تو ایسا ہے کہ آپ کو اس کی بات دنیا کی زندگی میں بہت بھلی لگتی ہے اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس پر وہ اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔ اور جب وہ پلٹتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے کھیتوں اور نسل کو تباہ کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔“ [1]

سریہ عاصم، یعنی حادثہ رجیع کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ﴾ ”اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو (اس کے ہاتھ) بیچ ڈالتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر بہت شفیق ہے۔“ [2]

امام ابوداود رحمہ اللہ نے یہ قصہ اختصار سے بیان کیا ہے۔ مرثد بن ابو مرثد غنوی رحمہ اللہ مکہ سے مسلمان قیدی اٹھایا کرتے تھے۔ مکہ میں ایک عناق نامی زانیہ عورت تھی جو مرثد رضی اللہ عنہ کی دوست رہ چکی تھی۔ مرثد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: اللہ کے رسول! کیا میں عناق سے نکاح کر سکتا ہوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے حتیٰ کہ آیت نازل ہو گئی:

﴿الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً﴾ ”زانیہ عورت سے نکاح نہیں کرتا مگر زانی یا مشرک مرد ہی۔“ [3]

[1]الدر المنثور في التفسير، وتفسير الطبري، البقرة 205,204:2- [2] الدر المنثور في التفسير، و تفسير الطبري، البقرة 207:2- [3] النور 3:24-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر قرآن کی آیت تلاوت کی اور فرمایا: اس سے نکاح نہ کرو۔“ [1]

امام نسائی رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ان آیات کی شان نزول کسی دوسری عورت کے حوالے سے بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں: ام مہزول نامی ایک بدکار عورت تھی اور وہ بدکاری کا پیشہ کرتی تھی۔ صحابہ میں سے کسی نے اس سے شادی کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور کی مذکورہ آیات نازل فرمادیں۔[2]

سعید بن منصور نے مجاہد سے بیان کیا ہے، انھوں نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے زنا کی حرمت کا حکم نازل فرمایا تو کچھ لوگوں کے پاس زانی عورتیں تھیں اور وہ خوبصورت بھی تھیں۔ ان لوگوں نے کہا: انھیں ایک دفعہ طلاق دیکر دوبارہ انھی عورتوں سے نکاح کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمادیں۔[3]

[1]سنن أبي داود، حديث: 2051، و جامع الترمذي، حديث: 3176- [2] سنن النسائي الكبرىٰ، حديث: 11359- [3] تفسير جلالين، النور 3:24، و سنن الكبرى للبيهقي:153،7-

فوائد واسباق

اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ پر جہاد فرض کیا ہے۔ جہاد شریعت اسلامیہ میں ایک بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو قوم اپنی نسلوں میں جہاد جاری نہیں کرتی اور نہ ان پر لازمی قرار دیتی ہے وہ ان معاشروں میں جینے کا حق نہیں رکھتی جن میں معقول باتوں کو ٹھکرایا جاتا ہو اور اللہ کی شریعت کو کالعدم سمجھا

جاتا ہو، نیز وہاں شیطان کا غلبہ ہو۔ اسلام قوت و طاقت کا دین ہے۔ اسے قوتوں والے غالب رب نے جاری کیا ہے۔ صابر و بردبار، اولو العزم اور امین نبی نے اسے امت تک پہنچایا ہے۔ قرآن کریم اس کی بنیاد ہے جس نے ہر مد مقابل کو چیلنج کیا ہے اور اسے مغلوب کر کے چھوڑا ہے۔ قرآن کی زبان عربی ہے جس نے دوسری ہر زبان کو گونگا کر دیا ہے۔

قرآن مجید ہی نے یہ بات واضح کی ہے کہ جو شخص قوت و طاقت، قوی عزم، مضبوط ایمان، پختہ عقیدے کا حامل اور مجاہد نہ ہو وہ اسلام کے بغیر مسلم، ایمان کے بغیر مومن اور ضمیر کے بغیر انسان ہے۔ چشمِ فلک نے وہ دن بھی دیکھے ہیں جب امت مسلمہ نے انتہائی مختصر عرصےمیں تمام آباد دنیا پر توحید کا ڈنکا بجادیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب امت اسلامیہ نے پرچم جہاد تھاما ہوا تھا اور عقیدے کی خاطر شہادت کا حصول فخر سمجھا جاتا تھا۔

سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرمایا کرتے تھے: میری نئی نئی شادی ہوئی ہو اور میری بیوی جس سے مجھے محبت ہو، وہ میرے پاس ہو یا مجھے بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری سنائی جائے تو یہ چیزیں مجھے اس انتہائی سرد رات سے زیادہ محبوب نہیں جس میں مجاہدین دشمن سے برسرپیکار ہوں، لہٰذا تم بھی جہاد ہی کو اپناؤ۔[1]

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ایسے ایمان والوں کا وصف بیان فرمایا ہے:

﴿كَانُوا قَلِيلًا مِنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ﴾

"وہ رات کو بہت ہی تھوڑا سوتے تھے۔" [2]

بے شک وہ تو ہمیشہ سرحدوں کی حفاظت میں رہتے ہیں۔ راتوں کو بھی بیدار رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کی یاد سے لمحہ بھر بھی غافل نہیں ہوتے۔ وہ اپنے اللہ کے حکموں کی ایک بار بھی سرتابی نہیں کرتے، نیز وہ اپنے آپ کو ہوش و حواس میں رکھتے ہیں، دین اور وطن کے دشمنوں سے آنکھیں بند نہیں رکھتے۔ انھوں نے اپنے رب کا یہ اعلان سن رکھا ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ، تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ، يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ، وَأُخْرَى تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِنَ اللهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ﴾

"اے ایمان والو! کیا میں تمھیں ایسی تجارت بتاؤں جو تمھیں دردناک عذاب

[1]عبقرية خالد للأستاذ عبا□ محمود العقاد، والبداية والنهاية:7/130، و مختصر تاريخ دمشق:3/37- [2] الذّٰريٰت 51:17-

سے نجات دے؟ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہ تمھارے لیے بہت بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔ وہ (اللہ) تمھارے گناہ بخش دے گا اور تمھیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور پاکیزہ محلات میں (جو) ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں ہیں، یہ ہے عظیم کامیابی۔ اور ایک اور (نعمت) جسے تم پسند کرتے ہو، اللہ کی طرف سے مدد اور فتح قریب، اور مومنوں کو بشارت دے دیجیے۔" [1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے رب کا اعلان سنا تو فوراً اس پر لبیک کہا۔ انھیں یقین تھا کہ یہی راستہ اللہ کی نصرت و مدد کا ہے۔ یہ اس کی شرائط ہیں: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر پختہ ایمان۔ اللہ کے راستے میں مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنا۔

پختہ ایمان عقیدے کی درستی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اور عقیدہ بھی وہی مطلوب ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔ ان کے سامنے دنیا فتح ہوتی چلی گئی اور سارا عالم ان کے راستے میں بچھتا چلا گیا۔

یہ بات برحق ہے کہ ہر شخص کے نزدیک جنگ انتہائی مکروہ اور ناپسندیدہ چیز ہے۔ جنگ نوجوانوں کو کھا جاتی ہے اور بوڑھوں اور بچوں کو ہلاک کر دیتی ہے۔ اسی وجہ سے جنگ کی آگ بھڑکانا اور جنگ کرنا دونوں ناپسندیدہ ہیں۔ قرآن نے اس کی طرف یوں اشارہ کیا ہے:

[1]الصف61: 10- 13-

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَكُمْ وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ وَعَسَى أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ وَاللهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾

"تم پر جہاد فرض کر دیا گیا ہے اور وہ تمھارے لیے ناگوار ہے اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔" [1]

یوم الخمیس1446ھ /7 شعبان المعظم / 2025م /6 فروری / ابو عطاالمنعم رضا اللہ بن الحاج خان بادشاہ باجوری حالا نزیل شریف آباد

[1]البقرة 216:2-

ذرا غور فرمایئے

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکارو! غور کرو، وہ صحابہ کرام جو مدرسہ قرآن کے فاضل تھے، کتنے عظیم لوگ تھے۔ اور وہ کیسا بے مثال منہج تھا جس پر قرآن نے انھیں چلایا۔ واقعی وہ دنیائے انسانیت کا بے مثل منہج تھا۔ ایسا منہج کہ جس پر چلنے کی وجہ سے شیطان کے حربے بھی ناکام ہوئے اور وہ لوگ دنیا میں رہ کر آخرت کے ہو گئے۔ مصیبت آنے پر وہ واویلا کرتے نہ نعمت ملنے پر اتراتے۔ فقیری انھیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کرتی اور تونگری انھیں

سرکش نہیں بناتی تھی۔ تجارت انھیں غافل کرتی، نہ قوت انھیں ظالم بناتی تھی۔ ایسے عظیم لوگوں کی زندگی پر غور کرکے انسان تعجب میں پڑ جاتا ہے کہ آخر وہ کیسے جلیل القدر انسان تھے۔

یہ سب مدرسۂ ایمان اور مدرسۂ تربیت کا اثر تھا اور اس اسوۂ حسنہ کا اثر تھا جو انھیں قوتِ ارادی، قوتِ ایمان، قوتِ دلیل، قوتِ محاسبۂ نفس اور عدل و انصاف سے بھر دیتا تھا۔

غور کیجیے! جعفر بن ابی طالب اور ان کے رفقاء ہجرت کر کے حبشہ کو جا رہے ہیں۔ بے سرو سامان ہیں۔ سرکش اور شریر لوگوں نے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ظالم و جابر لوگ ظلم و جبر کی شمشیریں لے کر ان پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ وہ حبشہ پہنچتے ہی ہیں کہ قریش نے پیچھے سے آدمی بھیج دیے تاکہ انھیں دوبارہ اپنی قید و بند اور رسوائی میں مبتلا کر سکیں۔ اسی دوران وہ شاہ حبشہ کے دربار میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور سر اٹھا کر اس حالت میں داخل ہوتے ہیں کہ ان کے دل اس بات پر مطمئن ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد ضرور نازل ہو گی۔ یہ دیکھتے ہوئے درباری پادری آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں: "باقی رعایا کی طرح تم بھی جھک جاؤ۔" لیکن دین کے لیے ہجرت کرنے والے سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ بڑے فخر، ایمان اور عزت سے کہتے ہیں: "ہرگز نہیں، ہم صرف اللہ کے آگے جھکتے ہیں۔"

آپ نے دیکھا کہ دنیا ان کی نظر میں کس قدر بے وقعت ہو گئی تھی۔ اور کس طرح ان کے دل قوتِ ایمان سے بھر گئے تھے۔ انھیں صرف اللہ کا خوف تھا اور وہ صرف اللہ کے عذاب سے ڈرتے تھے۔ ایرانی فوج کا سپہ سالار رستم سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو لکھتا ہے کہ آپ کوئی آدمی ہماری طرف بھیجیں تاکہ ہم اس کے ذریعے مسلمانوں کا تعارف حاصل کر سکیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ربعی بن عامر کو بھیجا۔ وہ آئے اور دیکھا کہ ایرانیوں نے بڑے قیمتی اور ریشمی تکیے لگائے ہوئے ہیں۔ بڑے قیمتی یاقوت سجا رکھے ہیں۔

رستم نے تاج پہنا ہوا ہے اور سونے کی چارپائی پر بیٹھا ہوا ہے۔ دوسری طرف ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ اس حالت میں داخل ہوتے ہیں کہ بڑے پرانے اور بوسیدہ کپڑے زیب تن ہیں۔ معمولی سا گھوڑا ہے۔ گھوڑے سے اترے نہیں بلکہ ان کے قالین کو روندتے ہوئے دربار میں پہنچے اور پھر اتر کر وہیں کسی تکیے کے ساتھ گھوڑے کو باندھا اور رستم کی طرف چل دیے۔ اسلحہ، زرہ اور خود سر پر ہے۔ محافظ آگے بڑھے اور کہنے لگے: "اپنا اسلحہ اتارو۔" انھوں نے کہا: "میں تمھارے پاس خود چل کر نہیں آیا، تم نے دعوت دی تھی۔

اگر اسی حالت میں اندر جانے دیتے ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ میں واپس چلا جاتا ہوں۔" رستم نے کہا: "انھیں اندر آنے دو۔" آپ آئے اور تکیے پر نیزہ رکھ کر اس کی ٹیک لگائی جس کی وجہ سے وہ تکیہ پھٹ گیا۔ اس نے ربعی بن عامر سے پوچھا: "تمھارا کیا پیغام ہے؟ آپ نے جواب دیا: "اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھیجا ہے تاکہ ہم بندوں کو بندوں کی عبادت سے ہٹا کر اللہ کی عبادت پر لگا دیں۔ دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعت کی طرف توجہ دلائیں اور باطل ادیان کے ظلم و زیادتی سے اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔"

غور فرمایئے! ربعی نے کہا: "اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھیجا ہے۔" کیسا عظیم جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں لوگوں پر حملہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کے دلوں کی دنیا بدل دینے کے لیے بھیجا تھا۔ آپ نے ان کے سامنے منہج اسلام کی چند بنیادی باتیں رکھیں اور کہا کہ صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی جائے۔ بندوں کو بندوں کی غلامی اور خواہشات کی غلامی سے نکالا جائے۔ اسلام کا نظام عدل قائم کیا جائے اور عوام الناس کو منحرف اور گمراہ لوگوں کے جال سے نکالا جائے۔ ایک بدوی (دیہاتی) اسلام کا تعارف حاصل کرنے کے لیے آتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر مجلس میں شرکت کرتا ہے اور ہر ہر بات نوٹ کرتا ہے حتیٰ کہ علم وحکمت سے پر ہو جاتا ہے۔ جب غزوۂ خیبر ہوا اور مال غنیمت آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حصہ بھی نکالا۔ یہ مسلمانوں کی سواریوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کا حصہ لے کر آئے تو اس نے کہا: "یہ کیا ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھارے لیے غنیمت میں سے حصہ نکالا ہے۔" وہ حصہ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: "اے اللہ کے رسول! یہ کیا ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ میں نے تمھارے لیے مال غنیمت کا حصہ نکالا ہے۔" اس نے کہا: "میں نے اس مقصد کے لیے تو آپ کی اتباع نہیں کی تھی۔ میں نے تو اس مقصد کے لیے آپ کی اتباع کی تھی کہ میں ادھر اُدھر دیکھوں (یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے اسلحہ کی طرف اشارہ کیا) شہید ہو جاؤں اور پھر جنت میں چلا جاؤں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم مخلص ہو تو اللہ تعالیٰ تمھاری اس بات کو ضرور سچا ثابت کر دے گا۔" پھر کچھ عرصہ بعد اللہ کے دشمنوں کے ساتھ قتال کا موقع آیا تو یہ شہید ہو گئے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کی میت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا یہ وہی بدوی ہے؟" جواب ملا: جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس نے دل سے سچی بات کی تھی، اللہ تعالیٰ نے سچ ثابت کر دی۔" [1]

اے امت محمد! تمھیں ان جیسے لوگوں پر رشک کیوں نہیں آتا۔ سلمان رضی اللہ عنہ بھی انھی لوگوں میں سے تھے۔

[1]زاد المعاد:190،2-

تتمّہ

اے صحرا نشینوں اور قرآن کی تعلیم سے اپنے سینوں کو منور کرنے والے طالبانِ علم! تم نے بہت خوب اور اچھا کام سرانجام دیا۔

اس مدرسے سے یہ طالب علم اور صحرا نشین معلم بن کر نکلے، انھوں نے انسانیت کے لیے سیاست، حکومت اور معیشت کا ایسا منصوبہ تیار کیا کہ اکیسویں صدی کی حکومتیں بھی ان کے منصوبے کی محتاج ہیں۔ یہ لوگ دنیا میں نکلے تو دنیا کا ساز و سامان، مال و دولت، ملک اور اقتدار پر تسلط ان کا مقصد نہیں تھا بلکہ وہ تو صرف اس لیے نکلے تھے کہ دنیا میں اللہ کا حکم نافذ ہو جائے اور اسلام کا پرچم ہر سو لہرائے تاکہ وہ بہترین امت کے صحیح مصداق بن جائیں۔

﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ [1]البقرة 143:2-

"اور (جیسے تمھیں ہدایت دی) اسی طرح ہم نے تمھیں افضل اُمت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔"

امت مسلمہ تصور اور اعتقاد میں سب سے بہترین امت ہے جو روحانیت سمیت کسیمعاملے میں غلو نہیں کرتی ہے۔ نظم و نسق میں بھی سب سے بہتر ہے، یہ اپنی زندگی کو جذبات اور پوشیدہ محسوسات کے حوالے نہیں کرتی، نہ تادیب و تشریح کے لیے اپنے آپ کو چھوڑتی ہے بلکہ اپنی عقل اور فطرت کے ساتھ ہر کام انجام دیتی ہے۔

لوگوں کے ساتھ میل جول اور تعلقات کے حوالے سے بھی بہترین امت ہے۔ یہ فرد کی شخصیت اور اس کی قیمتی اشیاء کو لغو قرار نہیں دیتی، نہ کسی فرد پر حلقۂ جماعت میں کوئی قدغن لگاتی ہے، بلحاظِ مکان بھی یہ سب سے بہتر امت ہے، یہ زمین کے اعلیٰ حصے اور اس کے بہترین ٹکڑوں میں موجود ہے، یہ بلند ترین امت ہے، یہ امت ہمیشہ وہ امت رہی ہے جس نے زمین کو گھیر رکھا ہے، یہ وہ امت ہے جو زمین کے مشرق و مغرب شمال و جنوب کے اطراف میں پھیلی ہوئی ہے اور سب امتوں سے بہتر امت ہے۔ یہ عہد طفولیت سے لے کر آخری عمر تک شریعت سے راہنمائی لیتی ہے جس کی بدولت وہ ہر شر اور فتنے سے بچی رہتی ہے۔ اپنی ایمانی قوت کی بدولت اس نے عالم کفر کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ قیصر روم کے دربار میں قبیلہ قضاعہ کا ایک آدمی ان کے اوصاف یوں بیان کرتا ہے: "

وہ رات کے وقت راہب ہوتے ہیں اور دن کے وقت شہسوار۔ اگر ان کے بادشاہ کا بیٹا بھی چوری کرلے تو وہ اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیں اور اگر وہ زنا کرے تو اس پر حد قائم کرکے اسے رجم کردیں۔" قیصر اس آدمی کی بات سن کر حیران ہوا کیونکہ ایسا تو کوئی نبی ہی کرسکتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی ہی میں یہ قانون لاگو ہوسکتے ہیں۔ قیصر نے ایک مشہور بات کہی: "اگر تو سچا ہے تو ان لوگوں سے جنگ کرنے سے بہتر ہے کہ ہم ویسے ہی

مَر جائیں اور زمین کے نیچے چلے جائیں۔" یقیناوہ عرب کے صحرا سے ایسا قوی مزاج اور جذبہ لے کر نکلے جو انھیں کچھ کر گزرنے پر ابھارتا تھا، پھر یہ ایسی قوموں سے ٹکرا گئے جو اپنی ظاہری طاقت کے نشے میں چور تھیں۔

یہ اپنی نماز کی ابتدا بھی "اللہ اکبر" کے کلمات سے کرتے ہیں۔ گویا وہ اپنے ہر قسم کے محسوسات، نفسانی خواہشات اور شہوات سے پھر جانے کا اعلان کرتے ہیں۔ نفسانی خواہشات کو کچل دینے کی وجہ ہی سے انھیں دنیا میں بہت اعلیٰ مقام و مرتبہ حاصل ہوگیا۔ یقیناً وہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے ساری دنیا میں حق اور باطل کے درمیان فرق واضح کیا۔ اپنے دین پر عمل کرنے اور اس کی برکات حاصل ہونے کی وجہ سے ان کا دائرہ کار وسیع ہوتا گیا وہ دین کی بدولت اور نفسانی خواہشات سے بچنے کی وجہ سے جب بھی کسی پر تلوار سونتتے تو دینی تعلیمات کو سامنے رکھ کر سونتتے اور جب اسے نیام میں رکھتے تب بھی اسی قانون کے تحت رکھتے تھے۔ انھوں نے لوگوں کو تہذیب و تمدن اور اخلاق کی تعلیمات سے آگاہ کرنے کے لیے مسلح اور غیر مسلح پیش قدمی کی۔ ان کے جہاد کا سبب بھی اخلاق تھا اور ان کا اسلحہ بھی بذات خود اخلاق والا ہی ہوتا تھا۔

یقینا یہ قانون اخلاق کا قانون تھا وہ ان کے تمام حربی معرکوں میں اسپیشل یارڈ کی حیثیت رکھتا تھا حتی کہ جھڑپیں شدت پر ہوتیں، تلواریں گردنیں کاٹ رہی ہوتیں اور بہادروں کو پچھاڑا جا رہا ہوتا تو تب بھی یہ اخلاق ہی کی دعوت دے رہے ہوتے تھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ایک معرکے میں دشمن کو گھوڑے سے گرا کر اس پر قابو پالیا، قریب تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ اس کا سر تن سے جدا کر دیتے لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے ایسا نہ کیا اور اسے چھوڑ دیا۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے، وہ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا: اے علی! تم نے اللہ

کے دشمن کو کیوں چھوڑ دیا۔ اسے قتل کیوں نہیں کیا؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "اے میرے بھائی! اس نے میرے چہرے پر تھوک دیا۔ مجھے شدید غصہ آیا، اسی لیے میں نے اسے قتل نہیں کیا۔

کیونکہ میں تو اس شخص سے اللہ کے لیے لڑ رہا تھا۔ میں اپنی ذات کے لیے کسی سے نہیں لڑتا، چونکہ اس کے تھوکنے کی وجہ سے مجھے ذاتی طور پر غصہ آ گیا تھا، اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔" کسی کہنے والے نے سچ ہی کہا ہے کہ ان کی تلواریں بھی اخلاق والی تھیں۔

ابوجہل (عمرو بن ہشام)

ابوجہل کمزور مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھانے والا بدبخت تھا۔ یہ مکہ میں مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اس میں فرعونیت پائی جاتی تھی۔ اس کے ظلم و ستم اور تکبر کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس امت کا فرعون قرار دیا ہے۔[1]

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اور ان جیسے کمزور مسلمانوں پر پتھر اور کوڑے برسانے والا یہی شقی القلب انسان تھا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جوف کعبہ میں نماز پڑھنے سے روکا تھا۔ یہی خبیث تھا جو دعوت اسلام اور اس کے حاملین کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ دارالندوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ گھڑنے والا بھی یہی خونخوار تھا۔ اس کا نام عمرو بن ہشام بن مغیرہ تھا۔ کنیت ابوالحکم تھی۔ اس کے ظلم و ستم، جاہلانہ اور جارحانہ طرزِ عمل کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کنیت ابوجہل رکھ دی۔

ماں کا لقب حنظلیہ اور نام اسماء بنت مخربہ بن جندل بن اُبیر بن نہشل بن دارم بن مالک بن حنظلہ تھا۔ اس کے بھائی کا نام حارث بن ہشام بن مغیرہ تھا۔ غزوۂ بدر میں جب ابوجہل کو قتل کر دیا گیا تو یہ خوف کے مارے وہاں سے بھاگ آیا تھا۔

اس پر حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے درج ذیل اشعار کہے تھے: "اگر تو اپنی بات میں جھوٹا ہے تو تو نے اس طرح نجات پائی جس طرح حارث بن ہشام بھاگ گیا۔ اس نے اپنے محبوبوں کو اپنے پیچھے لڑنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود بہت تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر جان بچا کر بھاگا۔" حارث بن ہشام نے ان اشعار کے جواب میں اپنا عذر یوں پیش کیا:

"اللہ جانتا ہے کہ میں نے اس وقت تک لڑائی سے منہ نہیں موڑا جب تک کہ انھوں نے میرے گھوڑے کو جھاگ پیدا کرنے والے تیز اور شفاف نیزے نہیں مارے۔ اور میں نے اس تنگ جگہ میں ان کی طرف سے موت کی خوشبو پالی تھی۔ اور گھوڑے بھی منتشر نہیں ہوئے تھے۔ میں جان گیا تھا کہ اگر میں اکیلا دشمن سے لڑتا تو قتل ہو جاتا۔ میری وہاں موجودگی سے دشمن کو کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ میں وہاں سے آ گیا جبکہ میرے محبوب لوگ وہیں تھے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ انھیں شدید عذاب پہنچنے والا ہے۔"

حارث بن ہشام فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوگئے تھے۔ اور بہت اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ ان کا شمار جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے۔ ابو جہل کے بیٹے کا نام عکرمہ تھا۔ وہ دورِ جاہلیت میں مکہ کا بہت بڑا شہسوار سمجھا جاتا تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر یمن کی طرف بھاگ گیا۔ اس کی بیوی اس تک پہنچی، اُسے "مہاجر سوار کو خوش آمدید۔" [1]

چنانچہ یہ اس وقت مسلمان ہوگئے اور بڑے اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: "تمھارے پاس عکرمہ آنے والے ہیں۔ جب وہ آجائیں تو ان کے والد ابو جہل کو برا بھلا مت کہنا کیونکہ میت کو برا بھلا کہنے سے اس کے زندوں کو تکلیف ہوتی ہے۔" [2]

سیدنا عکرمہ رضی اللہ عنہ نے معرکہ یرموک میں جام شہادت نوش کیا۔ ان کے ساتھ حارث بن ہشام اور سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہما بھی شہادت کے رتبہ پر فائز ہوئے۔

یہ لوگ جنگ کے میدان میں زخمی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ انھیں پانی پیش کیا گیا تو انھوں نے اپنے آپ پر اپنے بھائیوں کو ترجیح دی۔ جب ان میں سے کسی ایک کو پانی دیا جاتا تو وہ کہتا: "میری خیر ہے میرے فلاں بھائی کو پلا دو۔" سب ایک ایک کر کے شہید ہوگئے لیکن اپنے بھائی کو چھوڑ کر خود پانی نہیں پیا۔ اس واقعہ کی وضاحت کرتے ہوئے عبداللہ بن مطلب فرماتے ہیں: "عکرمہ رضی اللہ عنہ نے زخمی حالت میں پانی مانگا تو اتنے میں سیدنا سہیل رضی اللہ عنہ کی طرف سے آواز آئی کہ مجھے پانی پلا دو، چنانچہ عکرمہ رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: یہ پانی میرے بھائی کو پلا دو اسے مجھ سے زیادہ پیاس لگی ہے۔

جب پانی پلانے والا پانی لے کر سہیل رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو ساتھ ہی زخمی حالت میں پڑے ہوئے حارث رضی اللہ عنہ نے پانی کا سوال کیا تو سہیل رضی اللہ عنہ فرمانے لگے:

یہ پانی حارث کو پلا دو، اسے پانی کی زیادہ طلب ہے۔ ابھی وہ ان تک نہیں پہنچے تھے کہ سب کے سب اللہ کو پیارے ہوگئے۔" [3]

[1]جامع الترمذي، حديث: 2735- [2] الاستيعاب:3،1082، و السلسلة الضعيفة، حديث: 6234- [3] الاستيعاب:3،1084-

جی ہاں! یہ وہ عظیم شخصیات ہیں جنھوں نے تعلیماتِ اسلام کی تربیت حاصل کی تھی۔ جو اپنے لیے تو مخلص تھے ہی لیکن غیروں کے ساتھ بھی اخلاص کے ساتھ رہنے کی انتہا کر دی حتی کہ زندگی کے آخری چند لمحات میں بھی دوسروں کو ترجیح دیتے رہے۔ یہ ایسے لوگ تھے جو اپنی زندگی سے زیادہ اپنے دین کو محبوب سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نصرت اسلام کے لیے اپنی قیمتی ترین متاع بھی خرچ کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ دیکھیے ہر ایک دوسرے کی زندگی بچانے کا حریص ہے۔ اسی دوران وہ شہادت کے بھی متمنی ہیں جو ایک مجاہد مسلمان کا مقصد ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے حقیقی مالک سے جلد از جلد ملاقات کا شرف حاصل کر سکیں۔ تاہم اس دور میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جن کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

ان کی آنکھیں حق دیکھنے سے قاصر تھیں۔ دل ایسے سخت تھے کہ رحمت اور شفقت کے لیے نہیں دھڑکتے تھے۔ ان میں یہ احساس و شعور ہی نہیں تھا کہ غور و فکر کرتے اور ہدایت پاسکتے۔ اس دوسرے گروہ میں سے ایک ابو جہل بھی تھا جو بیک وقت اللہ تعالیٰ کا، دعوت اسلام کا اور حاملین دعوت اسلام کا دشمن تھا۔ کمزوروں کو اتنا عذاب اور تکالیف دیتا تھا کہ ان میں سے کچھ تو تاب نہ لاتے ہوئے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے جیسے ام عمار سیدہ سمیہ رضی اللہ عنہا ہیں انھیں اسلام کی پہلی شہیدہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔[1]

ابو جہل جب بھی کسی آدمی کے بارے میں سنتا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تابع ہو گیا ہے، تو اگر وہ حسب نسب والا ہوتا تو اسے کہتا: تو نے اپنے باپ کا دین چھوڑ دیا ہے، حالانکہ تیرا باپ تجھ سے افضل تھا۔ ہم تو تجھے عقل مند سمجھتے

[1]الروض الأنف:202/3-

رہے، تو تو بے وقوف نکلا۔ ہم تیرے مکر کو باطل کر کے چھوڑیں گے اور تیرے شرف وفضل کو رسوا کر دیں گے۔ اگر وہ تاجر ہوتا تو اسے جا کر کہتا: سن لے، ہم تیری تجارت کا مندا کر دیں گے، تیرا مال تباہ کر دیں گے اور تجھے کنگال کر کے چھوڑیں گے۔ اور اگر وہ ہر لحاظ سے کمزور ہوتا تو اسے جسمانی تشدد کا ہدف بناتا تھا۔[1]

جب اسے اپنے اخیافی بھائی عیاش بن ابی ربیعہ کی ہجرت کا پتا چلا تو فوراً مدینہ پہنچا اور سازش کے ذریعے سے اسے واپس مکہ لے آیا اور دن چڑھے مکہ میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے بھائی کو جکڑا ہوا تھا۔ اور بلند آواز سے کہہ رہا تھا: اے اہل مکہ! تم بھی اپنے بے وقوفوں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو ہم نے کیا ہے۔[2]

وہ شخص جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرتا، دین ابراہیم کو اپناتے ہوئے پتھروں اور بتوں کو سجدہ کرنے سے انکار کرتا اور مکارم اخلاق کو اپناتا وہ ابو جہل کی نظر میں بے وقوف ہوتا تھا۔

اس کے برعکس جو مردار کھاتا، بتوں کو پوجتا، کمزوروں کو پیٹتا اور حلال و حرام میں امتیاز نہ کرتا، ایسا شخص اس کی نظر میں بڑا سمجھدار اور دانشور ہوتا تھا۔ جہالت بکنے والے جس زمانے اور جس شہر کے بھی ہوں فکر سلیم سے خالی ہوتے ہیں۔ حقیقت تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ یہ ابو جہل مسلمانوں کا مذاق اڑاتا اور کہتا: تم ان کمزور لوگوں پر تعجب نہیں کرتے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تابع ہوئے ہیں۔ اگر وہ دعوت جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیش کرتے ہیں بہتر اور حق ہوتی تو یہ کمزور لوگ ہم سے سبقت نہ لے جاتے۔

[1]الروض الأنف:202/3- [2] السيرة النبوية لابن بشام:84/2-

کیا "زِنّیرہ" (لونڈی تھی جسے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آزاد کرایا) سچائی اور حق کو پانے میں ہم سے سبقت لے جاتی؟[1]

اس کی ڈھٹائی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب اللہ (قرآن) کا بھی مذاق اڑاتا، چنانچہ وہ کعبۃ اللہ کے پاس بیٹھ جاتا اور کہتا: اے قریش کی جماعت! محمد(صلی اللہ علیہ وسلم) کا گمان ہے کہ تمھیں جہنم میں عذاب دینے والے اللہ کے لشکروں کی تعداد 19 ہے۔ تم کثرت تعداد میں ان تمام لوگوں سے زیادہ ہو۔ کیا تمھارے 100 آدمی وہاں کے ایک شخص کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے؟

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا﴾

"اور ہم نے دوزخ کے داروغے فرشتے مقرر کیے ہیں۔ اور ہم نے (انیس کی) گنتی اس لیے مقرر کی ہے کہ کافر (یہ سن کر) گمراہ ہوں۔" [2]

افسوس ہے ان کم عقلوں پر۔ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ آگ اور اس پر نگران فرشتے اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب کسی امت کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لیے اسے کسی تعداد اور تیاری کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ تو محض حکم دیتا ہے اور سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ﴾

[1]الروض الأنف:221،3- [2] المدثر 74 :31-

" تیرے رب کے لشکروں کو صرف وہی جانتا ہے۔" [1]

ابو جہل نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کا مقام بتدریج لوگوں کی نظروں میں کم ہو تا جارہا ہے اور لوگ اسے حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ قرآنی آیات ان سخت دلوں کو جھنجھوڑ رہی ہیں جو اس کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی ساکھ برقرار رکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس کی اسی حالت پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ، طَعَامُ الْأَثِيمِ ، كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ، كَغَلْيِ الْحَمِيمِ﴾

"بے شک تھوہر کا درخت بڑے گناہ گار کا کھانا ہے۔ جیسے پگھلا تانبا، وہ پیٹوں میں کھولے گا تیز گرم پانی کے کھولنے کی طرح۔" [2]

ابو جہل نے کہا: اے قریش کی جماعت! کیا تم جانتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جس زقوم درخت سے تمھیں خوفزدہ کرتا ہے وہ کون سا درخت ہے؟ انھوں نے کہا: ہمیں معلوم نہیں۔ اس نے جواب میں کہا کہ اس سے یثرب کی عجوہ کھجور مراد ہے۔ اللہ کی قسم! اگر یہ ہمیں مل جائے تو ہم تو اسے نگل جائیں گے۔

ابو جہل نے اپنے ساتھ مکہ کے کئی ایک لوگوں کو ملا لیا تھا، یوں صرف ابو جہل ہی نہیں بلکہ اس کے پیروکار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گستاخی کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ بابل کے باشندوں میں سے ایک شخص مکہ آیا۔ اس کے پاس ایک اونٹ تھا، ابو جہل نے اس سے خرید لیا لیکن قیمت دینے میں ٹال مٹول کرنے لگا۔ وہ شخص قریش کی ایک مجلس میں پہنچا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مسجد کے ایک گوشے

[1]المدثر 74 :31- [2] الدخان 44: 46-43-

میں تشریف فرما تھے۔

پردیسی نے کہا: اے قریش کی جماعت! کون شخص مجھے ابو الحکم بن ہشام سے میرا حق لے کر دے گا۔ میں مسافر ہوں اس نے میرا حق دبا لیا ہے۔ مجلس والوں نے کہا: تم اس آدمی کو دیکھ رہے ہو؟ (انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔) تم اس کے پاس جاؤ، یہ شخص تمھیں تمھارا حق دلوا دے گا۔ قریشی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو جہل کے باہمی اختلاف سے خوب واقف تھے۔

انھوں نے جانے بوجھے اس پردیسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیا۔ بہر حال وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کی: اے اللہ کے بندے! ابو الحکم بن ہشام نے میرا حق دبا رکھا ہے۔ میں مسافر اور اجنبی ہوں۔ میں ان (قریشیوں) کے پاس مدد کے لیے گیا تو انھوں نے مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیا ہے۔ اب آپ مجھے میرا حق لے کر دیں، اللہ آپ پر رحم کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ چل پڑے۔ قریشیوں نے یہ صورت حال دیکھی تو انھوں نے اپنی مجلس سے ایک آدمی کو روانہ کیا اور کہا کہ دیکھو کیا بنتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو جہل کے دروازے پر پہنچے، دستک دی۔ اندر سے آواز آئی: کون ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں محمد ہوں، باہر آؤ۔" ابو جہل باہر آیا تو اس کا خوف کے مارے خون خشک ہوا جا رہا تھا اور رنگ اڑتا جا رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس آدمی کا حق اس کو دے دو۔" ابو جہل نے کہا: اچھا جی! آپ یہیں ٹھہریے میں ابھی لے کر آتا ہوں۔

وہ گیا اور فوراً مال لے کر آ گیا اور اس آدمی کو دے دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے اور پردیسی سے فرمایا: "اب خوشی سے جاؤ اور اپنا کام کرو۔" [1]

پردیسی سیدھا قریش کی اس مجلس کے پاس آیا اور کہا: اللہ جزائے خیر دے، اس آدمی نے میرا حق مجھے لے دیا ہے۔ وہ آدمی بھی آ گیا جسے انھوں نے دیکھنے کے لیے بھیجا تھا۔ مجلس میں سے کسی نے اس سے پوچھا: تیری تباہی ہو، بتاؤ تو سہی وہاں کیا دیکھا ہے؟ اس نے کہا: بہت ہی عجیب واقعہ ہوا ہے، اللہ کی قسم! بہت ہی عجیب معاملہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ وہ آیا تو اس کی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابو جہل سے کہا: اسے اس کا حق دے دو۔ تو اس نے کہا: دیتا ہوں جی، آپ ٹھہریے، میں ابھی لے کر آتا ہوں۔ وہ اندر گیا اور مال لا کر اس شخص کو دے دیا۔[2]

تھوڑی دیر بعد ابو جہل بھی آ گیا تو انھوں نے اس سے کہا: تمھارا مال تباہ ہو۔ اللہ کی قسم! آج سے پہلے ہم نے کبھی تمھیں ایسا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آج تمھیں کیا ہوا؟ اس نے کہا: تمھاری بربادی ہو! اللہ کی قسم! اس نے میرے دروازے پر دستک دی جونہی میں نے اس کی آواز سنی، میں مرعوب ہو گیا۔ جب میں باہر اس کے پاس آیا تو دیکھا کہ اس کے سر پر ایک نر اونٹ بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے اس جیسا اونٹ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ بہت بڑا سر تھا، بہت لمبی گردن اور بڑی بڑی انیاب تھیں اس کی۔ اللہ کی قسم! اگر میں انکار کر دیتا تو وہ اونٹ مجھے نگل جاتا۔[3]

جی ہاں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب پر بھروسا کرتے ہوئے ابو جہل کے پاس گئے تو

[1]البداية والنهاية:3،38- [2] البداية والنهاية:3،41- [3] الروض الأنف:3،372-

اللہ کی رحمت اور اس کے فرشتوں اور لشکروں کی صورت میں اس کی مدد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی۔ ابو جہل اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرنے لگا، یوں اس کی ہوا اکھڑ گئی۔ اسے لگا جیسے وہ اس بہت بڑے لشکر کے سامنے اکیلا ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں رعب ڈال دیا۔

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفا کے قریب تشریف فرما تھے، ابو جہل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ایذا دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو برا بھلا کہا اور اس کا مذاق اڑایا۔ ایک عورت آپ کے قریب کھڑی یہ سارا ماجرا دیکھ رہی تھی۔ اسے ان باتوں سے بہت تکلیف ہوئی لیکن کر کچھ نہیں سکتی تھی۔ یہ عورت مومنہ تھی لیکن ایمان کا اظہار ابھی تک نہیں کیا تھا۔ یہ عبد اللہ بن جدعان کی لونڈی تھی۔ اس نے جو کچھ دیکھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ کو بتا دیا۔

حمزہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ ماجرا سنا تو جلدی سے بھاگتے ہوئے بیت اللہ کے پاس آئے جہاں ابو جہل اپنے ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ آتے ہی حمزہ رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کے سر پر کمان دے ماری اور اسے شدید زخمی کر دیا۔ پھر کہا: "کیا تو اس (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو گالی دیتا ہے جب کہ میں خود اس کے دین پر ہوں۔ میں وہی کچھ کہتا ہوں جو وہ کہتا ہے۔ اگر طاقت ہے تو پھر ایسا کر کے دکھانا۔" [1]

بنو مخزوم کا ایک آدمی ابو جہل کی مدد کرنے آیا اور سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی طرف لپکا تو ابو جہل نے کہا: ابو عمارہ (حمزہ رضی اللہ عنہ) کو کچھ نہ کہو۔ اللہ کی قسم! میں نے اس کے بھتیجے کو بہت

[1]الكامل فى التاريخ:2،82-

فتیج گالی دی تھی۔[1]

ابو جہل نے محسوس کر لیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور وہ علی الاعلان اپنے اسلام کا اظہار بھی کرنے لگے ہیں۔ صرف حمزہ رضی اللہ عنہ کی بات نہیں تھی بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا اور وہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتے جا رہے تھے اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے میں سے کچھ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو تسلیم نہیں کیا تھا پھر بھی وہ دل و جان سے آپ کا ساتھ دے رہے تھے اور آپ کو بے یار و مددگار چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔

یہ دیکھتے ہوئے ابو جہل نے دارالندوہ میں بڑے بڑے سرداروں کی ہنگامی میٹنگ بلوائی۔ اس بیٹھک میں بنوہاشم کے بائیکاٹ کی قرارداد منظور کی گئی، باقاعدہ ایک دستاویز لکھی گئی اور کعبہ کے صحن میں لگادی گئی۔[2]

بائیکاٹ کے عرصے میں ایک دن ابو جہل حکیم بن حزام بن خویلد سے ملا۔ حکیم کے پاس کچھ آٹا تھا جسے وہ اپنی پھوپھی خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا تک پہنچانا چاہتے تھے۔ ابوجہل آڑے آگیا اور کہنے لگا: کیا تو بنوہاشم تک یہ کھانا بھیجنا چاہتا ہے، اللہ کی قسم! میں تجھے مکہ میں رسوا کردوں گا۔ اتنے میں ابوالبختری آگئے، انھوں نے اس جھگڑے کی وجہ پوچھی تو ابو جہل نے کہا: یہ بنوہاشم کو کھانا دینا چاہتا ہے۔ ابوالبختری نے کہا: وہ اپنی پھوپھی کے لیے کھانا لایا ہے اور تو کہتا ہے یہ اس کو کھانا نہ پہنچائے، یہ اچھی بات نہیں ہے اور یہ بھی ممکن نہیں کہ یہ کھانا دیے بغیر واپس چلا جائے، اسے جانے دو۔ ابو جہل پھر بھی راستے سے نہ ہٹا اور انھیں روکتا رہا، اس پر ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور

[1]الكامل في التاريخ:2،82- [2] الكامل في التاريخ: 2،82-87-

دونوں نے ایک دوسرے کو برا بھلا کہا۔ بات اور بڑھی تو ابوالبختری نے قریب پڑا ایک موٹا سا ڈنڈا اٹھایا اور ابو جہل کے سر پر دے مارا، وہ زخمی ہو گیا۔ ابوالبختری نے اسے زدوکوب بھی کیا۔ یہ سب کچھ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ دیکھ رہے تھے۔[1]

ظالم اور جابر لوگ اپنے عقیدے اور رائے کے مخالفین کو ہمیشہ سے جو سزا دیتے آرہے ہیں وہ یہی ہے کہ ظالم لوگ اپنے مخالفین کے منہ سے کھانے کا نوالہ بھی چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظالم لوگ اسے جو بھی نام دیں یہ ان کے گھٹیا پن، کمینگی اور دلوں کا تعفن نمایاں کرتا ہے۔ یہ لوگ رحمت و شفقت سے یکسر عاری ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ حق اور اہل حق کی مدد کرتا ہے اور جب تک وہ حق پر ڈٹے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کا دفاع کرتا رہتا ہے۔ لیکن آخر ایسا کیوں ہے کہ یہ دشمنی ہر اس شخص کے ساتھ ہوتی ہے جو کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے...۔

آخر اس عداوت کی کوئی حد کیوں نہیں؟ حتی کہ یہ لوگ ایک ایسے شخص سے بھی عداوت رکھتے ہیں جسے وہ خود امانت دار، پاکدامن اور معزز سمجھتے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کا جائزہ لیجیے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صادق وامین کہنے والے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے دشمن بن گئے۔ کیا ان لوگوں کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض تھا؟ جیسا کہ وہ کہتے تھے:

﴿ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَى رَجُلٍ مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ ﴾

"اور انھوں نے کہا: یہ قرآن ان دونوں شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل کیوں نہیں کیا گیا؟" [2]

[1]الروض الأنف:3،284، والسيرة النبوية لا بن ہشام:1،376- [2] الزخرف 43 :31-

یا یہ لوگ اس بات کے منکر تھے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے؟ اگر یہ وجہ بھی نہیں تھی تو آخر کیا وجہ تھی؟ کیا انھیں قرآن سننا پسند نہیں تھا؟

ابن اسحاق نے امام زہری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ ایک رات سفیان بن حرب، ابو جہل بن ہشام اور اخنس بن شریق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن سننے کے لیے نکلے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نماز پڑھ رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ قرآن سنتے رہے حتی کہ فجر ہو گئی، پھر یہ بکھر گئے۔ اچانک راستے میں ان کی آپس میں ملاقات ہو گئی تو سب نے ایک دوسرے کو ملامت کی اور کہنے لگے: "اس قسم کی حرکت پھر کبھی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر تمھارے کسی بے وقوف نے تمھیں دیکھ لیا تو بہت برا سمجھے گا۔"

دوسری رات پھر انھوں نے فجر تک قرآن سنا اور پھر راستے میں ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے ایک دوسرے کو پھر ملامت کی اور چلتے بنے۔ تیسری رات پھر انھوں نے ایسا ہی کیا، راستے میں جب ان کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوا تو آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے: "ٹھہرو! اب ہم ایک دوسرے سے معاہدہ کرتے ہیں کہ دوبارہ یہ حرکت نہیں کریں گے۔" چنانچہ معاہدہ کر کے چلے گئے۔[1]

صبح کو اخنس بن شریق نے اپنی لاٹھی لی اور ابو سفیان کے گھر جا پہنچا اور کہا: اے ابو حنظلہ! تو نے جو کچھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے اس کے بارے میں مجھے اپنی رائے سے آگاہ کر۔ اس نے کہا: اے ابو ثعلبہ! اللہ کی قسم! میں نے ایسی باتیں سنیں ہیں جو میں پہچانتا ہوں اور ان کی مراد بھی جانتا ہوں اور کچھ باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔

[1]السيرة النبوية لابن ہشام:1/338۔

ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أَمْ يَقُولُونَ بِهِ جِنَّةٌ بَلْ جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ وَأَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ﴾

"یا وہ کہتے ہیں کہ اسے جنون ہے؟ بلکہ وہ ان کے پاس حق لایا ہے اور ان کی اکثریت حق کو ناپسند کرنے والی ہے۔" [1]

قریش ہنگامی طور پر دارالندوہ میں جمع ہوتے تھے۔ اب اس طرح کی میٹنگیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہوتی تھیں۔ لیکن اس مرتبہ اس اجتماع کا مقصد صرف یہی تھا کہ کوئی خاص منصوبہ بنایا جائے تاکہ اس دعوت کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ یہ روایت بھی ہے کہ اس مجلس میں شیطان ایک تجربہ کار بزرگ کی شکل میں حاضر ہوا۔ حاضرین میں سے کسی نے بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو صبح سویرے اس کے بستر ہی سے اٹھالو اور پھر کسی گھر میں محبوس کر کے دیکھو کہ کیا صورت حال پیش آتی ہے۔ ابلیس نے کہا: تو نے بہت برا مشورہ دیا ہے۔ تم لوگ اسے جہاں بھی چھپاؤ گے اس کے ساتھی اسے نکال لے جائیں گے، پھر تمھارے اور ان کے درمیان خوب لڑائی ہو گی۔ سب نے ابلیس کی اس بات کو سراہا۔

پھر کسی نے مشورہ دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی بستی سے نکال دو۔ ابلیس نے پھر کہا: تو نے بھی بہت بری بات کی ہے۔ تم اسے اپنی بستی سے نکال دو گے تو کیا ہو گا۔ اس نے تو پہلے ہی سے تمھارے بیوقوفوں کو خراب کر دیا ہے۔ اس سے یہ ہو گا کہ وہ کسی دوسری

[1]المؤمنون 23 :70۔

بستی میں چلا جائے گا اور وہاں کے لوگوں کو بھی خراب کرے گا اور پھر تمھارے پاس بہت بڑا لشکر لے کر آ جائے گا۔ حاضرین نے کہا: ''بزرگ نے ٹھیک کہا ہے۔''

ابو جہل نے کہا: میرا مشورہ یہ ہے کہ تمام قبائل میں سے ایک ایک آدمی لیا جائے اور انھیں اسلحہ دے کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتل کے لیے بھیجا جائے۔ یہ سب یکبارگی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حملہ کر کے اسے (معاذ اللہ) قتل کر دیں۔ بنو مطلب تمام قریشیوں کو قتل کرنے سے تو رہے، لہٰذا وہ دیت ہی پر راضی ہو جائیں گے۔ ابلیس نے کہا: اس نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ یہ نوجوان تم سب سے زیادہ اچھی رائے والا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے کفار کی یہ سازشیں اور تدبیریں باطل کر ڈالیں۔ اللہ نے اپنے بندے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دے دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی نصرت و اعانت سے مکہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی آیات نازل فرمائیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رفیق ہجرت (ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) کو پڑھ کر سنائیں۔

﴿وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللهُ وَاللهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ﴾

''اور جب کافر آپ کے خلاف سازش کر رہے تھے کہ آپ کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا آپ کو نکال دیں۔ وہ بھی مکر کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔'' [2] و

ہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے کہ اس نے اپنے بندے کو کفر کے پنجوں سے بچا لیا۔

[1]تفسير الطبري:9/229- [2] الانفال 8: 30-

وہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے کہ اس نے گمراہ ٹولے سے اپنے بندے کو نجات دلائی۔ وہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے کہ اس نے اپنا وعدہ پورا فرمایا، اپنے محبوب بندے کی مدد فرمائی اور کفر اور اہل کفر کو ذلیل و رسوا کیا۔ کیا ابو جہل کا کینہ ختم ہو گیا تھا؟

کیا اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک لحظہ بھر کے لیے بھی غور و فکر کیا تھا؟ کیا اس کا ذہن اس بات کی طرف گیا کہ اللہ تعالیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہا ہے؟ کیا اسے یہ خیال نہیں آیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ پر جھوٹ نہیں گھڑ سکتے؟ حقیقت یہی ہے کہ ابو جہل اپنے کفر پر اڑا رہا۔ زندگی کی آخری رمق تک اس کے دماغ میں کفر کا بھُوسا بھرا رہا۔

اس نے عاتکہ بنت عبد المطلب کا یہ خواب بھی سنا کہ: ''قریش تین دن کے اندر اپنے موت کے گھاٹوں کی طرف روانہ ہوں گے۔'' اس نے خواب میں یہ بھی دیکھا تھا: ''جبل ابو قبیس پر ایک آدمی کھڑا ہے۔ اس نے بہت بڑا پتھر پھینکا جو ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اس کے ٹکڑے مکہ کے ہر گھر میں گرے۔'' [1]

ابو جہل نے جب یہ خواب اور باتیں سنیں تو سیدھا عباس بن عبد المطلب کے پاس پہنچا۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ طواف بیت اللہ میں مشغول تھے۔ ابو جہل نے اُن سے پوچھا: ''تم میں یہ نبیہ کب سے پیدا ہو گئی ہے؟'' [2]

پھر اس نے کہا: ''کیا یہ گنجائش باقی رہ گئی تھی کہ مردوں کے بعد اب تمھاری عورتوں نے بھی نبوت کا ڈھونگ رچا دیا ہے؟'' جو کچھ عاتکہ نے دیکھا تھا وہ حق اور سچ نکلا۔ ابھی تین دن نہیں گزرے تھے کہ قریش

[1]السیرۃ النبویۃ لا بن ہشام:2،244- [2] السیرۃ النبویۃ لا بن ہشام: 2،245

اپنے قافلے کو بچانے کے لیے نکلے جو سامان تجارت سے بھرپور تھا اور ابوسفیان کی قیادت میں شام کی طرف سے آ رہا تھا۔ تاہم ابوسفیان ساحل سمندر کا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے قافلہ بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے قریش کو پیغام بھیجا: ''تم اس لیے نکلے تھے کہ اپنے قافلے، اپنے سامان اور اپنے جوانوں کی حفاظت کرو۔ اللہ نے ہم سب کو بچالیا ہے، لہٰذا تم واپس چلے جاؤ۔''

ابو جہل نے کہا: اللہ کی قسم! ہم واپس نہیں جائیں گے۔ ہم ضرور مقام بدر جائیں گے، وہاں تین دن تک قیام کریں گے، اونٹ ذبح کریں گے، لوگوں کو کھلائیں گے، شراب پئیں گے اور ہمارے سامنے رقص ہوں گے۔ عرب ہمارے بارے میں سنیں گے تو ہم سے ہمیشہ مرعوب رہیں گے۔[1]

ابو جہل کی یہ باتیں حکیم بن حزام کو پسند نہ آئیں۔ اس نے عتبہ بن ربیعہ سے اس بارے میں مشورہ کیا تو اس نے بھی واپس جانے کے موقف کی تائید کی۔ جب حکیم نے ابو جہل کے سامنے عتبہ کا موقف بیان کیا تو اس نے کہا: ''جب اس (عتبہ) نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا تو ان کے جادو نے اسے بھی سحر زدہ کر دیا۔ اللہ کی قسم! ہم ہرگز واپس نہیں جائیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے۔''

جب عتبہ کو ابو جہل کا یہ جواب پہنچا تو اس نے کہا: ''آنے والا وقت ہی یہ بتائے گا کہ کس پر جادو چلا ہے؟ مجھ پر یا ابو جہل پر۔''

[1]السیرۃ النبویۃ لا بن ہشام:2،258-

ابو جہل کی ہلاکت

بدر کے مقام پر ایسا زبردست معرکہ ہوا جس نے حق و باطل میں ہمیشہ کے لیے فرق و امتیاز کی لکیر کھینچ دی۔ جس کی بازگشت تاریخ میں ابھی تک گونج رہی ہے۔ یہی معرکہ آج کے مظلوم و مقہور مسلمانوں سے مطالبہ کر رہا ہے کہ وہ معرکۂ بدر کی طرح کا ایک اور معرکہ انجام دیں۔

حق و باطل کا پہلا معرکہ شروع ہوا، کفر کا سرغنہ ابو جہل اپنی تلوار لہراتا ہوا یہ کہہ رہا تھا:

مَا تَنْقِمُ الْحَرْبُ الْعَوَانُ مِنِّي

بَازِلَ عَامَیْنِ حَدِیْثٌ سِنِّي

لِمِثْلِ ھٰذَا وَلَدَتْنِي اُمِّي

"جنگ میں کوئی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا، میرا طرزِ حرب وضرب بے مثال ہے۔ میری ماں نے مجھے اسی کے لیے ہی جنم دیا ہے۔"

سیدنا معاذ بن عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے لوگوں کو سنا، وہ کہہ رہے تھے: "ابو الحکم تک کوئی نہ پہنچنے پائے۔" جب میں نے یہ سنا تو میں نے تہیہ کر لیا کہ میں اس تک ضرور پہنچوں گا۔ میں اسی ارادے سے اس کی طرف چل پڑا۔ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے موقع دیا تو میں نے اپنی تلوار سے اس پر حملہ کر دیا۔ میں نے اسے ایسی ضرب لگائی کہ اس کی ٹانگ پنڈلی تک کٹ گئی، اسی دوران اس کے بیٹے عکرمہ نے مجھ پر وار کر دیا اور میرا بازو کٹ گیا۔ میں نے اپنے کٹے ہوئے بازو کو اپنے پہلو کے ساتھ ملا کر زور سے باندھ دیا۔ لڑائی کے دوران مجھے اس کی وجہ سے سخت تکلیف اٹھانی پڑی۔

میں سارا دن اسی لٹکے ہوئے ہاتھ کے ساتھ لڑتا رہا اور اپنے بازو کو پیچھے گھسیٹتا رہا۔ جب مجھے حد سے زیادہ تکلیف ہوئی تو میں نے اپنا بازو اپنے پیر کے نیچے رکھ کر کھینچا اور اسے علیحدہ کر کے دور پھینک دیا۔[1]

کیا آپ نے سنا اے اتباعِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویدارو! اے ابن الجموح کی اولاد!

کیا تم نے جہاد فی سبیل اللہ کی یہ شان دیکھی ہے؟

معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنے بازو کو کھینچ کر الگ کر دیا اور اسے دور پھینک دیا، اس لیے کہ وہ فریضۂ جہاد کی ادائیگی میں حائل ہو رہا تھا۔ تصور کرو اپنے ہی جسم کے عضو کو کھینچ کر دے مارا، یقیناً اس طرح کے کام اس طرح کے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ جتنا عمل وہ کر چکے تھے وہ ان کے لیے کافی تھا۔ دن کا اکثر حصہ تو وہ اسی طرح لڑتے رہے تھے، وہ شدید زخمی تھے اور ان کا ایک بازو کٹ گیا تھا۔ لیکن وہ ہار ماننے والے نہیں تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ حق اور باطل میں فرق کر دے اور چار دانگ عالم میں کلمۂ توحید بلند وبرتر ہو جائے۔ یہ انھی لوگوں کا کارنامہ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدرسے کے تربیت یافتہ تھے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی روشنی میں انھوں نے فنونِ حرب وضرب سیکھے تھے۔

جب معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہ کی نظر ابو جہل پر پڑی تو وہ شیر کی طرح ابو جہل پر ٹوٹ پڑے، اسے شدید زخمی کر کے زمین پر گرا دیا اور خود بھی شدید زخمی ہو گئے۔ ابو جہل زمین پر پڑا اپنی موت کا انتظار کر رہا تھا، ابھی اس میں زندگی کی رمق باقی تھی۔ معوذ رضی اللہ عنہ بدر کے اس معرکے میں لڑتے ہوئے شہادت کے عظیم منصب پر فائز ہو گئے۔ معرکۂ حق وباطل اختتام پذیر ہوا۔ یہ وہ عظیم معرکہ تھا جس میں فرشتوں نے بھی شرکت کی تھی، اسی لیے اللہ کے اس لشکر کو کامیابی حاصل ہوئی۔

[1]البدایة والنهایة:3، 287، والسیرة النبویة لا بن بشام:2،275۔

معرکہ ختم ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دیکھو ابو جہل کہاں ہے؟ اسے تلاش کرو۔ اگر وہ مقتولین میں چھپ گیا ہو تو اسے گھٹنے کے زخم کے نشان سے پہچاننا۔ ایک دفعہ بچپن میں عبد اللہ بن جدعان کی دعوت کے موقع پر ہم دونوں میں ہاتھا پائی ہو گئی تھی، میں اس سے طاقت میں کچھ زیادہ تھا۔ میں نے اسے دھکا دیا تو وہ گھٹنے کے بل گر پڑا تھا اور اس پر نہ ختم ہونے والے زخم کا نشان پڑ گیا تھا۔" [1]

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: تلاش کرتے ہوئے میں نے اسے پالیا۔ اس میں ابھی زندگی کی رمق باقی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ اس نے مکہ میں ایک مرتبہ مجھے پکڑ لیا تھا اور مجھے زدو کوب کیا تھا۔ میں نے اپنا پاؤں اس کی گردن پر رکھ دیا اور کہا: او اللہ کے دشمن! دیکھ لے، اللہ نے تجھے رسوا کر دیا ہے۔ اس نے کہا: اے بکریوں کے چرواہے تو ایک دشوار جگہ پر چڑھ گیا ہے۔

پھر میں نے اس کا سر تن سے جدا کر دیا اور اس کا سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں لے آیا اور عرض کیا: یہ اللہ کے دشمن ابو جہل کا سر ہے۔ پھر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وہ سر پھینک دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے الحمد للہ کہا اور اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "چل مجھے بھی (ابو جہل کی) لاش دکھا۔" میں چل پڑا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابو جہل کی نعش دکھائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ اس امت کا فرعون ہے۔" [2]

واقدی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معوذ بن عفراء کی لاش کے قریب کھڑے

[1]السیرة النبویة لا بن ہشام:2،276، والبدایة والنہایة:3،287- [2] البدایة والنہایة : 3،289-

ہو کر فرمایا: "اللہ تعالیٰ عفراء کے دونوں بیٹوں پر رحم فرمائے یہ دونوں اس امت کے فرعون اور کفر کے سرغنے کو قتل کرنے میں شریک تھے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی گئی: اے اللہ کے رسول! اس کو قتل کرنے میں ان دونوں کے ساتھ اور کون تھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور فرشتوں نے اس کے قتل میں شرکت کی ہے۔" [1]

[1]دلائل النبوة للبیهقي: 3،89-

سببِ نزول

ایک دن دار الندوہ میں قریشی زعماء جمع ہوئے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوا بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا پیغام سنتے ہی ان کی مجلس میں تشریف لے گئے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال یہ تھا کہ شاید میری بات ان کی عقل میں آگئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان کی ہدایت اور بھلائی کے حریص رہتے تھے۔ ان کا مشقت میں پڑنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر گراں گزرتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ قریشیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ نشانیوں اور ایسے دلائل کا مطالبہ کیا جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں جیسا کہ قرآن پاک میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

﴿وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا ۔ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۔ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۔ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِنْ زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَى فِي السَّمَاءِ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَقْرَؤُهُ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا﴾

"اور وہ کہتے ہم تو کبھی تیری بات ماننے والے نہیں جب تک تو ہمارے لیے ایک پانی کا چشمہ زمین سے نہ بہائے۔ یا تیرا ایک باغ ہو کھجوروں کا اور انگور کا

اور اس کے بیچ میں تو پانی کی بھرپور نہریں بہادے یا جیسا تو کہا کرتا ہے ہم پر آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرادے یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے آمنے سامنے لا کھڑا کر یا تیرا ایک گھر ہو سونے کا یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور صرف چڑھ جانے سے ہم ماننے والے نہیں جب تک ہم پر ایک کتاب نہ اتار لائے جس کو ہم پڑھ لیں۔ کہہ دیجیے: سبحان اللہ! میں صرف ایک انسان اور رسول ہوں۔" [1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ چاہے گا تو تمھارے یہ مطالبے پورے فرمادے گا۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم غمگین ہو کر وہاں سے لوٹ آئے کہ قوم نے ہدایت قبول نہیں کی تھی۔ اس وقت ابوجہل نے کہا: اے قریش کی جماعت! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمھاری باتوں کا انکار کر دیا ہے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ وہ ہمارے دین کی عیب جوئی کرتا ہے، ہمارے باپ دادا کو برا بھلا کہتا ہے، ہمارے سمجھداروں کو بے وقوف ٹھہراتا اور ہمارے معبودوں کو باطل کہتا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کل میں حجر میں ایک بھاری پتھر لے کر بیٹھوں گا، جوں ہی وہ سجدہ کرے گا میں اس کا سر کچل ڈالوں گا۔ پھر تم چاہو تو مجھے بچا لینا یا اس کے قبیلے کے سپرد کر دینا۔ اس کے بعد عبد مناف جو کرنا چاہیں کر لیں۔

انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہم تمھیں ان کے حوالے کبھی نہیں کریں گے، تم جو چاہتے ہو کر گزرو! چنانچہ جب صبح ہوئی تو اس نے پتھر اٹھایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرنے لگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معمول کے مطابق تشریف لائے۔ اس وقت مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان نماز پڑھتے اور کعبہ شریف

[1]بنی اسرائیل 17 :90-93۔

کو اپنے اور شام کے درمیان رکھتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے اللہ کے حضور کھڑے ہوگئے۔ قریش بھی اپنی اپنی مجالس میں بیٹھ گئے تھے تاکہ دیکھیں کہ ابوجہل کیا کرتا ہے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا تو ابوجہل نے پتھر اٹھایا اور چلتا ہوا آپ کے قریب پہنچا۔ جونہی وہ قریب آیا تو الٹے پاؤں دم دبا کر بھاگ گیا، اس کا رنگ فق ہو گیا اور دہشت کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے پتھر بھی گر گیا۔ قریش کے لوگ اس کے پاس آئے اور پوچھا: "ابوالحکم! تجھے کیا ہو گیا ہے؟" اس نے کہا: جب میں اپنے اس مقصد کے لیے اٹھا جو میں نے تمھیں کل بتایا تھا۔ اور اسی مقصد کے لیے اس کے قریب گیا تو میرے سامنے ایک زبردست طاقت والا نر اونٹ آ گیا۔ اللہ کی قسم! میں نے پہلے کبھی اس جیسے کوہان، سر، اور خوفناک کچلیوں والا اونٹ نہیں دیکھا۔ وہ تو مجھے کھانے ہی لگا تھا کہ میں پیچھے ہٹ گیا اور بھاگ آیا۔ جب یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ جبریل تھے اگر یہ ظالم قریب آتا تو وہ اسے پکڑ لیتے۔" [1]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابو جہل وہیں سے ایڑیوں کے بل بھاگا۔ اس کے ساتھیوں نے پوچھا: "تجھے کیا ہو گیا ہے؟" تو اس نے جواب دیا: "میں نے دیکھا کہ میرے اور اس کے درمیان ایک دہشت ناک آگ کی خندق ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر وہ قریب آتا تو فرشتے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔" [2]

امام احمد، ترمذی، نسائی اور ابن جریر رحمہم اللہ نے اپنی کتابوں میں یہ روایت بیان کی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں ابو جہل کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس نے کہا: "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! کیا

[1]الروض الأنف:3،372، والبداية والنهاية:3،43، وصحيح البخاري: 4658- [2] مسند أحمد:2،370، وصحيح مسلم: 2797-

میں نے تمھیں اس سے منع نہیں کیا؟" اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھمکایا تو آپ نے بھی اسے جھڑکا اور سخت الفاظ کہے۔ وہ کہنے لگا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! تم مجھے کس چیز سے ڈراتے ہو؟ اللہ کی قسم! اس پوری وادی میں میرے حمایتی بہت زیادہ ہیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ، سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ﴾ "چاہیے کہ وہ اپنے مددگار دوستوں کو بلائے، ہم بھی سخت جان فرشتوں کو بلائیں گے۔" [1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اگر وہ اپنے لوگوں کو بلاتا تو فرشتے اس پر عذاب کے کوڑے برساتے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[2] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابو جہل نے کہا: کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھارے سامنے سجدہ کرتا ہے؟ کفار نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: مجھے لات وعزیٰ کی قسم! اگر میں نے اسے نماز پڑھتے دیکھ لیا تو اس کی گردن پر پاؤں رکھوں گا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بری نیت سے بڑھا تو اچانک وہ ایڑیوں کے بل بھاگتا ہوا واپس آیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا، اس سے پوچھا گیا کہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے کہا: میرے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان آگ کی بہت بڑی خندق بن گئی تھی، وہ ایک دہشت ناک منظر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کا پتا پانی کر دیتے۔" [3]

اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

[1]العلق 96 :18-17- [2] جامع الترمذي، حديث: 3349، و مسند أحمد:1،256- [3] صحيح مسلم، حديث: 2797-

﴿ كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغَى ، أَنْ رَآهُ اسْتَغْنَى ، إِنَّ إِلَى رَبِّكَ الرُّجْعَى ، أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَى ، عَبْدًا إِذَا صَلَّى ، أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَى الْهُدَى ، أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَى ، أَرَأَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّى ، أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللهَ يَرَى ، كَلَّا لَئِنْ لَمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ، نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ، فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ، سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ، كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾

"ہر گز نہیں انسان جب اپنے آپ کو دولت مند دیکھتا ہے تو سرکش ہو جاتا ہے۔ بے شک تیرے رب ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ تو نے دیکھا کہ جب ایک بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نماز پڑھتا ہے تو یہ اسے روکتا ہے۔ بھلا دیکھ تو اگر وہ (بندہ) ہدایت پر ہو یا اچھی بات کا حکم کر رہا ہو۔ بھلا دیکھ تو اگر وہ (سچے دین کو) جھٹلاتا ہو اور (اس سے) منہ موڑ رہا ہو۔ کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ ہر گز نہیں۔ اگر وہ باز نہ آیا تو ہم (قیامت کے

دن) اس کی چوٹی پکڑ کر اسے گھسیٹیں گے، جھوٹی پیشانی کو۔ اس کو چاہیے کہ وہ اپنے دوستوں کو بلائے ہم بھی سخت جان فرشتوں کو بلالیں گے۔ ہر گز نہیں! اس کا کہنا مت مانیے۔ اور (اللہ کو) سجدہ کیجیے اور (اس کا) قرب حاصل کیجیے۔" [1]

[1]العلق 96 :6- 19-

ابو جہل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کا معترف تھا

کیا ابو جہل نے دعوت اسلامی کی مخالفت کا بیڑہ اٹھایا تھا؟ مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کے پس پردہ کون سے اسباب کام کر رہے تھے؟ وہ قریش کو اس بات پر کیوں اُکساتا تھا کہ وہ کمزور مسلمانوں کو عذاب کا نشانہ بنائیں؟ کیا اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کے بارے میں شک تھا یا اُن پر نازل ہونے والی وحی کے بارے میں جسے وہ اپنے رب کریم سے نقل کرتے تھے؟ یہ بھلا کیسے ممکن تھا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صادق اور امین کے لقب سے مشہور تھے۔ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے بارے میں تو سچے تھے لیکن (نعوذ باللہ) اللہ کے بارے میں جھوٹے تھے؟ یا ابو جہل کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند مقام و مرتبہ سے حسد تھا؟ حقیقت اس قصے سے عیاں ہوتی ہے کہ ابو جہل اخنس بن شریق اور ابو سفیان کے ساتھ مل کر مسلسل تین راتیں چھپ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن سنتا رہا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ابو جہل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا نہیں سمجھتا تھا، اس قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ظالم اور ہٹ دھرم تھے، ضد بازی میں آکر اس دین اور اس دین کے پیروکاروں کے درپے ہو گئے تھے۔

ابن ہشام فرماتے ہیں: اخنس بن شریق نے ابو جہل سے قرآن کے بارے میں اس کی رائے پوچھی تو ابو جہل نے کہا: تم کیا سمجھتے ہو؟ کیا ہمارا اور بنو عبد شمس کا شرف و منزلت میں کوئی اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ وہ لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں تو ہم بھی کھلاتے ہیں۔ وہ بھی لوگوں کو مفت سواریاں تقسیم کرتے ہیں تو ہم بھی کرتے ہیں، وہ لوگوں کو مال دیتے ہیں تو ہم بھی سخاوت میں ان سے کم نہیں۔ اب وہ کہنے لگے ہیں کہ ہم میں نبی ہے جس کے پاس آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے۔

ہمیں یہ شرف کب حاصل ہو گا؟ اللہ کی قسم! ہم اس پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے اور کبھی اس کی تصدیق نہیں کریں گے۔ کیا اس سرکشی اور کفر کا سبب عزت و منزلت اور شہرت کی حرص تھی؟ جزیرۂ عرب میں اثر ورسوخ کی خواہش اور لالچ تھا؟ کیا یہی چیزیں ابو جہل کے لیے وحی پر غور و فکر کرنے اور اسے قبول کرنے کی راہ میں حائل ہو گئی تھیں۔

بنو عبد مناف ہمیشہ ہی سے بلند عہدوں پر فائز تھے۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا، غلام آزاد کرنا، مصائب میں لوگوں کا ساتھ دینا وغیرہ۔ ان میں بڑے بڑے بہادر اور شہسوار موجود تھے جو جنگی لشکروں کی قیادت کرتے اور دشمن کو شکست دیتے تھے اور قریش کے لیے مدد اور مالِ غنیمت لاتے تھے۔

جبکہ دوسری جانب بنو امیہ یہی کوشش کرتے رہتےتھے کہ وہ کسی طرح بنو عبد مناف کے ہم پلہ ہو جائیں اور اس طرح کی نیکیاں کریں جس طرح وہ کرتے ہیں اور برائیوں سے ویسے ہی دور رہیں جیسے وہ دور رہتے ہیں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ ان کاموں میں بنو عبد مناف سے سبقت لے جائیں، اس

سے بنو امیہ کے دلوں میں ان کے خلاف کینہ اور حسد پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ابھی تک یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور قریش اور بنو عبد مناف پر حکمرانی کریں گے۔

اسی دوران اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا۔ آپ اللہ کے دین کی تبلیغ کرنے لگے اور لوگوں کو اس دین کی طرف بلانے لگے۔ کفار نے یہ سمجھ لیا کہ یہ نبوت ورسالت بنو عبد مناف کے لیے شرف ومنزلت کا ایک اور بہت بڑا درجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کیا ہے۔ اس سے ان کے دلوں میں حسد اور قبائلی تعصب کی آگ بھڑک اٹھی، چنانچہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پیروی کرنے والوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس موقع پر ابو جہل نے یہ کلمہ کہا تھا جسے تاریخ نے محفوظ کر لیا: ''آخر ہمیں یہ مرتبہ کب حاصل ہو گا؟''

لوگوں کو راہ حق سے روکنے اور حق کی روشنیوں کو بجھانے میں ابو جہل کا یہ کردار تھا جو غزوۂ بدر میں اس کی ہلاکت کے بعد ختم ہو گیا لیکن ہم ہر زمانے اور ہر شہر میں نت نئے ابو جہل دیکھ رہے ہیں۔

ہم ایسے ابو جہل کو سیاسی میدان، جنگی میدان، تعلیمی اداروں اور زندگی کے ہر میدان میں موجود پاتے ہیں۔ ہمارے اس دور میں اس طرح کے جہلاء موجود ہیں جنھوں نے مکر وفریب اور دھوکہ دہی سے اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ چنانچہ جب انھوں نے حکومت حاصل کر لی اور انھیں اختیارات مل گئے تو انھوں نے اپنی رائے عوام پر ٹھونسنا شروع کر دی اور زبر دستی اقتدار سنبھال کے لوگوں کو غلامی کی زندگی جینے پر مجبور کر دیا۔ ہم عالم اسلام اور خصوصاً عالم عرب کے اربابِ تعلیم وتربیت سے کہتے ہیں کہ وہ اس فریب کاری اور دھوکہ دہی کو خود بھی ترک کریں اور اپنے آپ کو اور اپنے مسلمان بھائیوں کو مشرق ومغرب کے دستر خوانوں سے بچائیں۔ یہ ہمارے لیے نہیں بنائے گئے کیونکہ یہ ہرگز ہمارے مفاد میں نہیں ہیں۔ ان لوگوں کی اپنی عادات، افکار اور ثقافت ہے اور قطعاً کوئی شک نہیں کہ یہ ہماری ثقافت، عادات اور افکار کے خلاف ہیں۔ جب ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے تو ہمیں دوسروں کے آئین وقوانین اپنانے کی کیا ضرورت ہے؟ جب خود قرآن اور سنت کی شکل میں ہمارے پاس آفتابِ ہدایت موجود ہے تو ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہم غیروں کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں سے روشنی کی بھیک مانگیں؟ حالانکہ اس میں ہمارے لیے کوئی فائدہ نہیں۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے تجربے اب بانجھ ہو چکے ہیں اور اب ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے؟ یا ہماری عقل اور غور وفکر کے چشمے خشک ہو گئے ہیں؟ کیا اب ہم غور وفکر کرنے سے عاجز آ چکے ہیں؟ یا ہماری پہچان، ہماری شناخت اور ہماری تہذیب وثقافت کے مقاصد ختم ہو چکے ہیں کہ یہ ہماری زندگی کے لیے کارگر اور بہتر ثابت نہیں ہوتے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے وہ تجربے جس سے ہم نے ساری دنیا کو مہذب بنایا، آج بھی موثر اور کارگر ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہماری عقل اور سوچ جس نے انسانیت کو اس کے اصل راستے پر چلایا اور اس کا منہج واضح کیا، آج بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب جس نے جاہلیت اولیٰ کو ختم کیا اور وہ توحید خالص اور دین قیم ہمارے پاس لائی، ابھی تک اس میں یہ صلاحیت باقی ہے کہ وہ جاہلیت ثانیہ کو ختم کر سکتی ہے اور شرک، الحاد اور نفاق کے سفینے ڈبو سکتی ہے۔ اے پاک پروردگار! تیرا وعدہ کب پورا ہو گا؟ اور بیسویں صدی کے ابو جہل اور اس کے پیروکاروں سے ہماری جان کب چھوٹے گی جنھوں نے لوگوں اور شہروں کی اقدار پر اپنا غاصبانہ تسلط جما رکھا ہے؟ اے اللہ! تیری نصرت کا وعدہ کب پورا ہو گا؟

رحم کر اپنے، نہ آئینِ کرم کو بھول جا!

ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا

دائمی مشعل

اللہ کے دین کے داعیوں کے راستے میں آنے والی مشکلات اور پریشانیاں انھیں منہجسے کبھی نہیں ہٹا سکیں اور ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آئی، اس لیے کہ یہ اللہ کے بندے اور اس کے غلام ہیں اور غلام اپنے کسی معاملے کے مالک و مختار نہیں ہوتے، لہٰذا وہ اپنے کام میں از خود کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے۔ اسی لیے ساری دنیا اپنے تمام لاؤ لشکر سمیت مل کر بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی وجہ سے فرمایا تھا: ''اللہ کی قسم! چچا جان! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں اور کہیں کہ میں اس دین کی تبلیغ سے باز آ جاؤں، تب بھی میں دین کی تبلیغ ہر گز نہیں چھوڑوں گا حتیٰ کہ یہ دین دنیا میں غالب ہو جائے یا میں اس راہ میں لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان آپ کے بعد آنے والے داعیانِ اسلام کے لیے ایسی مشعلِ راہ بن گیا جس کی روشنی میں وہ ساری زندگی عمل کرتے رہیں گے۔ دین کے مقابلے میں اس فانی دنیا کی کوئی حیثیت نہیں۔ دنیاوی زندگی انتہائی مختصر اور فانی ہے۔

اس مختصر سی دنیوی زندگی کا وقت مقرر ہو چکا ہے، اس کے بعد ہمیشہ کی زندگی شروع ہو گی اور دنیوی زندگی کے اعمال کا حساب کر کے جزا اور سزا دی جائے گی۔ جب دنیا کی زندگی کے وقتِ مقررہ میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی تو پھر اس بے ثبات زندگی سے چمٹے رہنا اور فنا ہو جانے والی نعمتوں کے پیچھے دوڑتے رہنے کا کیا فائدہ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی بے ثباتی کی مثال بیان کر کے قریش کی عقلوں کو جھنجھوڑا مگر قریش کے بے وقوف سرداروں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ انھوں نے اپنی عقل کے دریچوں کو بند رکھا، وہ اپنی خواہشات کے پیچھے پڑے رہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری پر اڑے رہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر اکٹھے ہو کر ابو طالب کے پاس آئے اور کہنے لگے: ابو طالب! یہ قریش کا تنومند اور خوبصورت جوان عمارہ بن ولید لے لو، اسے اپنا بیٹا بنالو اور اس کے عوض اپنے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارے حوالے کر دو۔ اس نے ہمارے اور تمھارے بڑوں کے دین کی مخالفت کی ہے، تمھاری قوم میں تفرقہ ڈالا ہے اور وہ ہمیں بے وقوف بھی کہتا ہے۔ اسے ہمارے حوالے کر دو تا کہ ہم اسے قتل کر کے اپنے بزرگوں اور معبودوں کی بے عزتی کا بدلہ چکا سکیں۔ تمھیں آدمی کے بدلے آدمی مل جائے گا۔

ابو طالب نے جواب دیا: اللہ کی قسم! تم نے بہت برا سودا کیا ہے۔ تم مجھے اپنا بیٹا اس لیے دو کہ میں اسے کھلاؤں پلاؤں اور میں تمھیں اپنا بیٹا اس لیے دے دوں کہ تم اسے قتل کر دو؟ اللہ کی قسم! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس موقع پر مطعم بن عدی کہنے لگا: اللہ کی قسم! اے ابو طالب! تمھاری قوم نے تمھارے ساتھ انصاف کا معاملہ کیا ہے اور تمھیں پریشانی سے نجات دلانے کی کوشش کی ہے۔ تم اپنی قوم سے کچھ تو قبول کرو، ان کا کوئی فیصلہ تو مانو!!

ابو طالب نے کہا: اللہ کی قسم! ان لوگوں نے میرے ساتھ کوئی انصاف نہیں کیا بلکہ تم نے میری قوم کو میرا دشمن بنانے اور میرے خلاف بھڑکانے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ جاؤ! تم سے جو ہو سکتا ہے کر لو، میں اپنے بھتیجے کو تمھارے حوالے نہیں کروں گا۔ ابو طالب اور ان کے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف مختلف قبائل نے اتحاد کر لیا۔

ابو طالب نے جب دیکھا کہ قریش بنو ہاشم اور بنو مطلب کے خلاف سازشیں کرنے لگے ہیں تو انھوں نے اپنے خاندان بنو ہاشم اور بنو مطلب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا۔ اللہ کے دشمن ابو لہب کے سوا سب نے ابو طالب کی تائید کی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی خاطر سب اکٹھے ہو گئے۔ بنو ہاشم اور بنو مطلب چاہے وہ مسلمان تھے یا ابھی تک حالتِ کفر میں تھے، وہ سب ان باتوں پر متفق ہو گئے کہ 1۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اول، آخر ہمارے بھائی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم الصادق الامین بھی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کبھی کسی برائی کی نسبت نہیں کی جا سکتی، نہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بے حیائی کا ارتکاب کیا ہے۔

2۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو تعلیمات لے کر آئے ہیں، انھیں اگر ہم دین نہ بھی تسلیم کریں، تب بھی کم از کم وہ عمدہ اخلاق کے مالک ضرور ہیں۔ تمام بنو ہاشم اور بنو مطلب کی زبان پر یہی تھا کہ ہم بھوکے پیاسے مر جائیں گے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے سپرد نہیں کریں گے۔[1]

قریش نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کا یہ اتفاق دیکھا تو انھوں نے ان کے خلاف بائیکاٹ کا معاہدہ لکھنے کا پروگرام بنا لیا کہ

1۔ ان سے رشتہ لو نہ انھیں رشتہ دو۔ 2۔ ان سے خرید و فروخت بھی نہ کی جائے۔ جب قریش کا ان امور پر اتفاق ہو گیا تو انھوں

[1]السيرة النبوية لابن ہشام:1/267۔

نے اس پر قسمیں اٹھائیں اور یہ معاہدہ لکھ کر کعبہ کے اندر لٹکا دیا تاکہ ان کے دل بھی اس پر عمل کے لیے آمادہ رہیں۔ دو یا تین سال تک قریش اس قطع رحمی کے معاہدے پر قائم رہے۔ بنو ہاشم اور بنو مطلب کو انتہائی سخت مشقت اٹھانی پڑی۔ ان کے پاس کھانے پینے کی کوئی شے نہیں پہنچ سکتی تھی یہاں تک کہ کوئی قریشی صلۂ رحمی کے جذبے سے مخفی طور پر کچھ پہنچا دے۔

ابن ہشام رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب سے فرمایا: "چچا جان! میرے رب نے قریش کے بائیکاٹ کے معاہدے والی تحریر پر زمین کا کیڑا یعنی دیمک مسلط کر دی ہے۔ اس نے اللہ کے نام کے سوا ظلم، قطع رحمی اور جھوٹ وغیرہ ہر شے کو چاٹ لیا ہے۔" ابو طالب نے پوچھا: کیا تمھارے رب نے اس بات کی خبر دی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جی ہاں۔"

ابو طالب نے کہا: اللہ کی قسم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ میں ابھی قریش کو جا کر اس کی خبر دیتا ہوں۔ ابو طالب باہر نکلے اور قریش کی جماعت کے پاس جا کر کہنے لگے: اے قریش کی جماعت! میرے بھتیجے نے بائیکاٹ والی تحریر کے بارے میں اس کے محو ہو جانے کی خبر دی ہے۔ ذرا اپنی وہ تحریر تو لاؤ۔ اگر میرے بھتیجے کی بات سچی ہے تو تعلقات منقطع رکھنے سے باز آ جاؤ اور قطع تعلقی کے بارے میں جو تم نے معاہدہ لکھا ہے اس سے دستبردار ہو جاؤ۔ اور اگر میرے بھتیجے نے غلط کہا ہے تو میں اسے تمھارے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔

قریش نے کہا: ہمیں منظور ہے اور انھوں نے اس بات پر اتفاق کر لیا، پھر انھوں نے اپنی تحریر کو دیکھا تو اس کی وہی حالت ہو چکی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تھی۔ لیکن قریش اپنی خباثت میں اور زیادہ بڑھ گئے۔ انھوں نے اس معاہدے کا انکار کر دیا، اس طرح قریش کے ایک گروہ نے تحریر چاک کرنے میں اپنا کردار ادا کیا۔

ظلم کا یہ معاہدہ تو چاک ہو گیا مگر قریش اپنی پرانی دشمنی پر اڑے رہے۔ ادھر جناب ابو طالب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت پر ڈٹے رہے تا کہ کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا یا تکلیف نہ پہنچا سکے۔ ابو طالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھرپور تعاون کرتے رہے حتی کہ ایک دن ایسا آیا کہ جناب ابو طالب گھر سے باہر نہ آسکے اور قوم کے ساتھ زندگی کی گاڑی رواں رکھنے میں شریک نہ ہو سکے۔ یہ بیمار ہو گئے، ان کے لیے چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا۔ چند دن کی بیماری کے بعد ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ یوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غمخوار چچا کا سایہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر سے ہمیشہ کے لیے اٹھ گیا۔[1]

[1]السيرة النبوية لابن ہشام:1/377۔

آیات کا سببِ نزول

حضرت سعید بن مسیب اپنے والد مسیب رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں، انھوں نے فرمایا: جب ابو طالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس آئے۔ اس وقت ابو طالب کے پاس ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
((أَيْ عَمِّ! قُلْ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ كَلِمَةً أُحَاجُّ لَکَ بِهَا عِنْدَ اللّٰهِ))

''چچا جان! آپ ایک مرتبہ لا الہ الا اللہ کہہ لیں، یہ ایسا کلمہ ہے کہ میں قیامت کے دن اسے اللہ کے ہاں آپ کے لیے بطورِ دلیل پیش کروں گا۔'' ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی اُمیہ نے کہا: ابو طالب! کیا تم اپنے باپا عبد المطلب کے دین سے منہ موڑ رہے ہو؟ کفر کے یہ دونوں سرغنے ابو طالب کو کفر پر جماتے رہے حتی کہ اس کے منہ سے آخری بات یہی نکلی کہ میں عبد المطلب ہی کے دین پر مر رہا ہوں۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے آئے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

((وَاللّٰهِ! لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ مَا لَمْ أُنْهَ عَنْکَ))

''اللہ کی قسم! جب تک مجھے اس بات سے روکا نہ گیا میں اللہ سے تمھارے لیے بخشش طلب کرتا رہوں گا۔'' اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کفار اور مشرکین کے متعلق یہ آیات نازل فرما دیں:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَى مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ﴾

''نبی(صلی اللہ علیہ وسلم)اور مومنوں کے لائق نہیں کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے والوں کے لیے استغفار کریں، اگرچہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، خصوصاًاس کے بعد کہ انھیں پتہ چل گیاہے کہ وہ جہنم والے ہیں۔'' [1]

محمد بن کعب القرظی نے کہاہے: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ جب ابو طالب بیمار پڑ گئے اور قریب الموت ہوئے تو اس وقت قریش نے کہا: ابو طالب! اپنے بھتیجے کو پیغام بھیجو، وہ تمھارے لیے اس جنت سے شفالے آئے جس کا ذکر وہ کرتا رہتاہے۔ ابو طالب نے ایک شخص کو بھیجا، وہ گیاتو اس نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تشریف فرماہیں۔ قاصد نے آکر کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کے چچانے پیغام بھیجا ہے کہ اب میں بوڑھا، کمزور اور بیمار ہو گیاہوں، آپ اپنی اس جنت میں سے کچھ کھانے پینے کا سامان بھیج دیں جس کا آپ تذکرہ کرتے رہتے ہیں، شاید مجھے شفامل جائے۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: اللہ تعالیٰ نے جنت کافروں پر حرام قرار دی ہے۔ قاصد واپس قریش کے پاس آیااور کہنے لگا: میں نے تمھاراپیغام محمد(صلی اللہ علیہ وسلم)تک پہنچادیاہے مگر انھوں نے مجھے کچھ نہیں دیا، بلکہ ابو بکر(رضی اللہ عنہ) نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ نے جنت کا کھانااور پانی کافروں پر حرام کر دیاہے۔

[1]التوبة 9 :113، صحيح البخاري، حديث: 4772، وصحيح مسلم، حديث: 24۔

تھوڑی دیر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور ابو طالب کے گھر تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچے تو آپ نے دیکھا کہ ابو طالب کاگھر لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے راستہ دو میں اپنے چچاکے پاس بیٹھنا چاہتاہوں۔'' قریش کے لوگوں نے کہا کہ ہم راستہ نہیں دیں گے۔ تم ان پر ہم سے زیادہ حقدار نہیں ہو، اگر یہ تمھارے رشتہ دار ہیں تو ہماری بھی ان سے ایسی ہی رشتہ داری ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچاکے قریب بیٹھ گئے اور فرمایا: ''اے چچاجان! آپ صرف ایک کلمہ کہہ کر مجھ سے تعاون کیجیے، میں قیامت کے دن اللہ کے ہاں اس کلمے کی وجہ سے آپ کی سفارش کر سکوں گا۔'' ابو طالب نے کہا: وہ کون سا کلمہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((قُلْ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيکَ لَهٗ))

''آپ ایک بار لا الٰہ الا اللہ یعنی اس بات کی گواہی دے دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ اکیلاہے، اس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں۔'' ابو طالب نے کہا: بھتیجے! تم یقیناًمیری خیر خواہی کے لیے تشریف لائے ہو، مگر اللہ کی قسم! اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ قریش مجھے طعنہ دیں گے کہ ابو طالب موت کے وقت اپنے باپ دادا کے دین سے پھر گیاہے تو بیٹامیں ضرور تمھاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا۔

قریش بھی چلائے کہ اے ابو طالب! بزرگوں کے دین کے اصل سر دار تم ہی ہو۔ ابو طالب نے قریش کی یہ باتیں سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: بھتیجے! اگر میں نے یہ کلمہ پڑھ لیاتو کہیں ایسانہ ہو کہ قریش کی عورتیں یہ کہتی پھریں کہ تمھارا چچاموت سے گھبر اگیاتھا۔ قریش کے سر دار بھی بول پڑے: اے ابو طالب! تم ہی تو بزرگوں کے دین کے اصل مالک اور سر دار ہو، کیاتم اپنے باپ دادا کے دین سے بے وفائی کروگے؟

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچاسے فرمایا:

((لَا أَزَالُ أَسْتَغْفِرُ لكَ رَبِّي حَتّٰى يَرُدَّنِي))

"جب تک میرا رب مجھے منع نہ کر دے میں آپ کے لیے اپنے رب سے بخشش طلب کرتا رہوں گا۔"

ابو طالب کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ عرصہ تک اُن کے لیے استغفار کرتے رہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ دیکھا تو کہنے لگے: جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے استغفار کیا ہے اور اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے چچا کے لیے استغفار کر رہے ہیں تو پھر ہم بھی اپنے آباء و اجداد اور رشتہ داروں کے لیے استغفار کیوں نہیں کر سکتے؟ چنانچہ انھوں نے بھی اپنے مشرک رشتہ داروں کے لیے استغفار کرنا شروع کر دیا حتی کہ اللہ تعالیٰ نے آیات نازل فرمائیں:

﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ، وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴾

"نبی اور ایمان والوں کے لیے لائق نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی ہوں، ان کے متعلق یہ بات واضح ہو جانے کے بعد کہ وہ بلاشبہ دوزخی ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا کرنا بس ایک وعدے کے باعث تھا جو وعدہ انھوں نے اس (اپنے باپ) سے کیا تھا، پھر جب ابراہیم پر واضح ہو گیا کہ وہ یقیناً اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گئے بے شک ابراہیم بڑے نرم دل، بہت تحمل والے تھے۔" [1]

[1]أسباب نزول القرآن للواحدی، التوبۃ 9: 114,113-

آثار و اسباق

مذکورہ بالا سطور میں آپ نے پڑھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت زیادہ کوشش کے باوجود ابو طالب نے کلمۂ توحید کا اقرار نہیں کیا۔ وہ زندگی بھر اپنے باپ دادا ہی کے دین پر قائم رہے، حالانکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہترین معاون تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل دفاع کرتے رہے تھے۔ کیا اس توقف کا سبب یہ تھا کہ ابو طالب اپنے بھتیجے کی دعوت و تبلیغ کو باطل تصور کرتے تھے جس کا کوئی فائدہ نہ تھا؟ یا وہ نعوذ باللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا نہیں جانتے تھے؟ [1]أسباب نزول القرآن للواحدی، التوبۃ 9: 114,113-

سیرت و تاریخ کا قاری اس امر کو محال تصور کرتا ہے کہ ابو طالب جیسا شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی میں شک کرے گا۔ کیونکہ ابو طالب ہی وہ شخص ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن اور آپ کی جوانی کو سب لوگوں سے زیادہ قریب سے دیکھا، پھر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن اور جوانی میں (قبل از نبوت) ظاہر ہونے والے بہت سارے معجزات اور نشانیاں بھی دیکھی تھیں، اور وہ آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کے بچپن ہی میں آپ سے رونما ہونے والی ایسی برکات کا مشاہدہ کر چکے تھے جن کے ہوتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں اگر کسی کے دل میں ذرہ برابر بھی شک کا شائبہ ہوتا تو وہ دور ہو جاتا۔

ابو طالب نے تو یہ بھی دیکھا تھا کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کے وقت اُن کے بچوں کے ساتھ بیٹھتے تھے تو کیسی برکت ہوتی تھی۔ تھوڑے سے کھانے میں بھی سب پیٹ بھر کر کھا لیتے تھے اور پھر بھی کھانا بچ جاتا تھا۔ اسی طرح جب تجارت کے سفر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ساتھ ہوتے تو کس قدر نفع ہوتا تھا، ابو طالب نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملات اور اخلاق و احوال کا بچپن اور جوانی میں سب سے بڑھ کر عینی مشاہدہ کیا تھا۔ انھوں نے آپ کی ذاتِ بابرکات میں رائی برابر بھی کبھی کوئی عیب نہ پایا۔

ابو طالب نے دیکھا کہ کعبہ کی تعمیر نو کرتے ہوئے حجر اسود کی تنصیب کے وقت جو زبردست جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا تھا، اُسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حسنِ تدبر نے کتنی خوش اسلوبی سے حل کر دیا اور لوگوں کو ایک ہولناک خون خرابے سے بچا لیا۔ اُس وقت مکہ مکرمہ کے سب گروہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل و دانش پر دنگ رہ گئے۔

شام کے تجارتی سفر میں بصری کے راہب بحیرا سے بھی ابو طالب نے یہ سنا تھا کہ مستقبل میں یہ بچہ نہایت عظیم الشان مرتبے پر فائز ہو گا۔ اسی شام کے تجارتی سفر سے واپسی پر ابو طالب نے خود بھی مشاہدہ کیا کہ سخت دھوپ میں ایک بدلی مسلسل آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سایہ کیے ہوئے ہے، پھر جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی تو اس وقت جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی طرف سے نقل کیا، ابو طالب نے اس کے بارے میں اپنے بھتیجے پر قطعاً کوئی شک نہیں کیا۔

ان تمام امور کے ہوتے ہوئے بھی ابو طالب کفر ہی پر کیوں اڑے رہے؟ انھوں نے اسلام قبول کرنے میں تامل کیوں اختیار کیے رکھا؟ اسلام قبول کرنے میں جلدی کیوں نہ کی؟ اس معاملے میں ان کے مد نظر کون سی شے مانع تھی؟

کیا انھیں اس بات کا ڈر تھا کہ عورتیں باتیں بنائیں گی کہ ابو طالب آخری وقت موت سے گھبرا گیا تھا جیسا کہ انھوں نے موت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا۔ یا پھر انھوں نے قریش کے طعنوں سے اپنے بچاؤ کی تدبیر کی تھی اور قوم کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی۔ اگر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ وہ تو اپنے بھتیجے کی حفاظت کے لیے قریش اور اس کے سرداروں کے مد مقابل ڈٹ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے قریش کی طرف سے بڑی سے بڑی پیشکش بھی مسترد کر دی تھی اور یہ مطالبہ بھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اکیلا چھوڑ دو اور اس کی مدد نہ کرو۔

جب ابو طالب نے قریش کے مطالبات تسلیم نہ کیے اور وہ ان سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ابو طالب کو بھی جانی اور مالی تکالیف پہنچائی تھیں۔ انھیں اور بنو ہاشم کے دیگر افراد کو سماجی و معاشی بائیکاٹ کے سخت محاصرے میں ڈال دیا تھا۔ اس محاصرے کی وجہ سے ابو طالب

اور مسلمانوں کو انتہائی سخت تکالیف اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ قریش نے تین سال تک بنو ہاشم سے انتہائی ظالمانہ بائیکاٹ کیے رکھا، انھوں نے بنو ہاشم سے اپنی رشتہ داریاں بھی توڑلی تھیں اور ان کے ساتھ ہر قسم کی تجارت بھی بند کر دی تھی۔

ان سب پریشانیوں کے باوجود ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھرپور ساتھ دیا۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دفاع میں ایک لمحہ بھی غفلت نہیں برتی تھی۔ ابو طالب کو جب حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے متعلق پتہ چلا کہ اس نے مکہ سے اپنا دین بچا کر آنے والے مہاجرین کی خوب آؤ بھگت اور تکریم کی ہے تو انھوں نے نجاشی کی تعریف میں اشعار لکھ کر اس کی خدمت میں ارسال کیے تھے اور ان اشعار میں مسلمانوں کی تائید و نصرت جاری رکھنے پر بھی زور دیا تھا۔

کیا ابو طالب نے یہ سب کچھ اپنے بھتیجے کے دفاع میں کیا تھا؟ کیا یہ ساری تکالیف وہ قومی اور خاندانی عصبیت کی بنا پر اٹھا رہے تھے اور بنو ہاشم کے دُرِ یتیم کی طرف اٹھنے والے ہر طاقت ور ہاتھ کو روک رہے تھے؟ یا ابو طالب نے یہ سب کچھ کر کے اپنی اور اپنے خاندان کی جان اس لیے خطرے میں ڈالی کہ وہ قلبی طور پر مسلمان ہو گئے تھے اور انھوں نے دعوتِ اسلام کو برحق تسلیم کر لیا تھا؟ قرآن کریم نے ان تمام امور کی نفی کی ہے جو ابو طالب کو مسلمان ثابت کرنے کے لیے گھڑے گئے ہیں، نیز قرآن نے اس کی اصل حقیقت اور صحیح موقف کو خوب واضح کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ، وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴾

''نبی اور ایمان والوں کے لیے لائق نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی ہوں۔ ان کے متعلق یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ وہ بلاشبہ دوزخی ہیں۔ اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا کرنا بس ایک وعدے کے باعث تھا جو وعدہ انھوں نے اس سے کیا تھا، پھر جب ابراہیم پر واضح ہو گیا کہ یقیناً وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بیزار ہو گئے۔ بے شک ابراہیم بڑے نرم دل، بہت تحمل والے تھے۔'' [1]
اسلام قبول کرنے کے لیے کلمہ توحید کا اقرار بہت ضروری ہے کیونکہ کلمہ توحید میں حاکمیت اور عبادت صرف اللہ کے لیے خاص کی گئی ہے۔

نیز اس نے تمام کاہنوں، بتوں، پیروں، مذہبی پیشواؤں، امراء اور حکام کی حکومت ختم کر کے صرف اللہ ہی کی حاکمیت اعلیٰ کا اعلان کیا ہے۔ اس کلمے کا اصل مقصود بھی یہی ہے کہ تمام معبودانِ باطلہ کی خدائی کا انکار کر کے ایک اللہ کے سامنے سر جھکایا جائے۔ قرآن کے نزول کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ صرف اللہ کی ذات کے ثبوت کے لیے دلائل پیش کیے جائیں کیونکہ اللہ کی ذات کا تو عربوں کو بھی انکار نہیں تھا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کو خالق، رازق، بادشاہ (مالک) زندگی عطا کرنے والا، مارنے والا اور دیگر صفات کا مالک تصور کرتے تھے۔

انھیں انحراف کی بنا پر مشرک کہا گیا کہ وہ اپنی زندگیوں میں، اپنے معاملات میں اور اپنے آئندہ آنے والے حالات اور رزق وغیرہ کے امور میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک مانتے تھے۔ ان کے اسی گھناؤنے عمل کی بنا پر قرآن نے انھیں مشرک قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعتقادات کا حال بیان فرماتے ہوئے توحید الوہیت کی حقیقت بھی بیان فرما دی، اللہ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ فَأَنّٰى يُؤْفَكُونَ ﴾

''اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیے اور (کس نے)

[1]التوبۃ 9: 114,113-

سورج اور چاند کو خدمت پر مامور فرمایا ہے تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ تعالیٰ نے! پھر وہ کہاں بہکائے جاتے ہیں؟'' [1]

اس آیت مبارکہ میں اللہ نے اپنی الوہیت اور کائنات کی مکمل نگہبانی کی حقیقت واضح کر دی ہے کہ اس کی الوہیت اور بادشاہت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کے باوجود مشرکین بتوں، کاہنوں، نجومیوں، جوتشیوں، ستاروں اور شیاطین کی طرف اس لیے مائل ہوتے ہیں کہ وہ ان کے زعم کے مطابق انھیں اللہ کے قریب کر دیتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفَىٰ ﴾

''ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ (بت وغیرہ) ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کر دیں۔'' [2]

آج ہم جس دور میں زندہ ہیں اس دور میں اکثر لوگ سیدھے اور سچے راستے، یعنی شاہراہِ توحید سے بھٹک کر شرک کے گڑھوں میں گر رہے ہیں۔ شرک کے اندھیروں میں صرف چند افراد ہی نہیں گرے ہوئے بلکہ جماعتوں کی جماعتیں اور ملکوں کے ملک اسی گھٹاٹوپ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بعض افراد کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ اللہ کی مخلوق میں سے کچھ افراد نفع ونقصان اور رزق دینے پر قادر ہیں، اس لیے وہ ان بزرگوں کے قریب ہوتے ہیں اور ان کی کامل فرماں برداری کرتے ہیں، انھیں نذر ونیاز پیش کرتے ہیں۔ مشرکین مکہ بھی ایسے ہی تھے، وہ اپنے بتوں اور مورتیوں کے بارے میں ایسا ہی عقیدہ رکھتے تھے اور ان کی تعظیم کرتے تھے۔

[1]العنکبوت 29 :61- [2] الزمر 39 :3-

ہمارے ہاں ''مقدس پیروں فقیروں'' کا ایک طبقہ ہے۔ بدقسمتی سے اکثر گمراہ ذہن کے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ساری بادشاہت بس ایک پیر کے پاس ہی ہے، ضعیف العقیدہ لوگ اسے خدائی کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس کی ایک ایک بات نوٹ کی جاتی ہے، اس کے وعدوں کا دل سے احترام کیا جاتا ہے، اس کی زندگی میں اس کی خوب عزت افزائی ہوتی ہے اور اسے تقدیس کا درجہ دیا جاتا ہے۔ جب وہ فوت ہو جائے تو اس کا بت بنا کر ملک کے

مختلف حصوں میں نصب کیا جاتا ہے یا اس کا شاندار مزار بنا دیا جاتا ہے۔ لوگ اسے متبرک سمجھنے لگتے ہیں اور ثواب کی نیت سے اس کی زیارت کا قصد کرتے ہیں۔ میرے رب نے اپنے فرمان میں اس بات کو کیا خوب بیان فرمایا ہے:

﴿ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ﴾

"اور تحقیق ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں۔ ان کے دل تو ہیں مگر وہ ان سے (حق کو) سمجھتے نہیں، اوران کی آنکھیں تو ہیں مگر وہ ان سے (حق کو) دیکھتے پرکھتے نہیں، اور ان کے کان تو ہیں (مگر) وہ ان سے (حق بات) سنتے نہیں، وہ تو چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ (ان سے بھی) زیادہ گمراہ ہیں، یہی لوگ غافل ہیں۔" [1]

[1]الأعراف 7 :179-

تاویل اور تفسیر

قرآنی آیات کی تشریح و توضیح کے لیے تفسیر کے علاوہ تاویل کا لفظ بھی بکثرت مستعمل رہا ہے۔

محمد بن جریر طبری (متوفی 310ھ) نے اپنی اولین تفسیر کا نام " جامع البیان عن تأویل ای القرآن "رکھا ہے، آیات کی تفسیر میں بھی ان کے ہاں لفظ تاویل ہی جا بجا مستعمل ہے۔ آیت کے ذیل میں عموماً لکھتے ہیں " :تأویل قولہ عزوجل "ابن قتیبہ نے اپنی کتاب کا نام " تأویل مشکل القرآن "رکھا ہے۔ قاضی بیضاوی نے بھی اپنی تفسیر کا نام " اِنوار التنزیل واِسرار التأویل "رکھا ہے۔

خود قرآن مجید نے بھی اپنی تفسیر کے لیے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے۔﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ﴾)آل عمران: 7)

"حالانکہ مراد اصلی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" چونکہ یہ لفظ تفسیر کی جگہ پر مستعمل ہے، اس کی لغوی و اصطلاحی وضاحت بھی ضروری ہے۔ تاویل باب "تفعیل" سے مصدر ہے جس کا ماخذ " اِول "ہے جو آل یؤول کے باب سے مصدر کا صیغہ ہے اور درج ذیل معانی میں مستعمل ہے۔[1]

فہم و فراست اور سیاست: یہ ثلاثی مجرد سے اس معنی میں زیادہ مستعمل ہے۔ اس معنی میں کہتے ہیں " :آل الرعية يؤو لها ايالة حسنة وهو حسن الايالة "اس نے رعایا پر بہترین سیاست کی۔ زیاد نے اپنے خطاب میں کہا تھا ":قد الناوايل علينا اي سُسنا و سِسنا[2] "

[1]أسا□ البلاغة، للزمخشري، ص 12 (مادة أول) [2] أسا□ البلاغة، ص: 12

یعنی ہم نے سیاست کی اور ہم پر سیاست کی گئی۔

(1) کفالت وسرپرستی: جب "عليٰ" کے صلہ کے ساتھ ہو تو یہ معنی دیتا ہے۔" آلَ عَلَي القَوْمِ ، وليهم "[1]"اس نے قوم کی سرپرستی کی۔"

(2) واپس لوٹنا، لوٹانا، کہتے ہیں: " اَوَّلَ الحُكمَ اِليٰ اَهلِهٖ " اس نے فیصلہ لوگوں کی طرف لوٹا دیا۔ جس کی کوئی چیز گم ہو جائے تو اسے دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں: " اَوَّلَ الله عَلَيْكَ، اَي: رَدَّ عَلَيْكَ ضَالَّتَكَ"[2]اللہ تجھے تیری گمشدہ چیز واپس لوٹائے۔

(3) نتیجہ، انجام: اس معنی میں کہتے ہیں: " لا تُعَوِّلُ عَلَي الحَسَبِ تَعْوِيّلاً فَتَقْوَي الله أَحْسَنِ تَأْوِيلاً" [3]

حسب پر بھروسہ مت کیجئے، تقویٰ باعتبار انجام سب سے بہتر چیز ہے۔

(4) کم ہونا: " طَبَخْتُ الدَّوَاءَ حَتّٰي آلَ المَنَّانَ مِنْهُ اِليٰ منٍّ وَّاحِدٍ"[4]میں نے دوا کو اس قدر پکایا کہ دو من سے کم ہو کر بالآخر ایک من رہ گئی۔

(5) نشانات دیکھنا: " تأملته فتأولت فيه الخير" [5]

میں نے اس میں غور کیا ہے اور اس میں خیر ہی دیکھی ہے، اس سے مترشح ہوتا ہے کہ علامات و آثار کے ذریعے سے کسی نتیجہ پر پہنچنے کو بھی تاویل کہتے ہیں۔

(6) غور و فکر کرنا اور تشریح کرنا: " أَوَّلَ الكَلَامَ تَأْوِيّلاً وَتَأَوَّلَهٗ، دَبَّرَهٗ وَقَدَّرَهٗ وَفَسَّرَهٗ" [6]

اس نے کلام کو مرتب و منظم کیا اور اس کی تشریح کی۔

(7) اصلاح کرنا اور مال وغیرہ کا بطریق احسن استعمال کرنا: "آلَ المَالَ، أَصْلَحَه وسَاسَه" [7]

اس نے مال کی اصطلاح کی اور اسے اچھے طریقے سے استعمال کیا۔

[1]القامو المحيط الفيروز آبادي، 1275/2 [2] أسا البلاغة، ص 12 [3] ايضاً [4] أسا البلاغة، ص: 12 [5] ايضاً [6] القامو المحيط: 1275/2 [7] ايضاً

قرآن مجید میں لفظ تأویل کے استعمالات

قرآن مجید میں تاویل کا لفظ سترہ مقامات پر آیا ہے۔[1]

اور مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔[2]

(1) **تاویل بمعنی تحریف**

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۗ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾

"وہی تو ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیتیں محکم ہیں (اور) وہی اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ ہیں تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کا اتباع کرتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور تاویل کا پتہ لگائیں حالانکہ مراد اصلی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں دست گاہ کامل رکھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر امان لائے یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو عقلمند ہی قبول کرتے ہیں۔" (آل عمران:7)

اس آیت مبارکہ میں راہ راست سے انحراف اختیار کرنے والے لوگوں پر تبصرہ ہے کہ وہ اپنے دل میں موجود کجروی اور زیغ وضلال کی بنیاد پر واضح، صاف اور محکم آیات کو نظر انداز کرتے ہوئے تمام تر توجہ متشابہ آیات پر صرف کرتے ہیں۔ یہ فتنہ جو لوگ اپنے باطل نظریات کو ثابت کرنے کے لیے متشابہ آیات میں تحریف کرکے اسے اپنی مرضی کا معنی پہناتے ہیں۔

[1]دیکھئے: المعجم المفهرس لألفاظ القرآن، مادہ (تأویل) [2] دیکھیے: علوم القرآن، گوہر رحمان، 216/2، 221۔ مولانا گوہر رحمان نے اس کے متفرق معانی پر خوب داد تحقیق دی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "وقوله تعالیٰ﴿ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾ أي تحريف علىٰ ما يريدون" فرمان باری تعالیٰ ﴿وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ﴾ سے مراد ہے، اپنی مرضی اور پسند کے مطابق تحریف۔[1]

ثابت ہوا کہ درج بالا آیت مبارکہ میں لفظ "تأویل" بمعنی تحریف ہے۔

(2) **تأویل بمعنی حقیقی مفہوم**

درج بالا آیت مبارکہ میں لفظ "تأویل" دو دفعہ الگ الگ معنی میں مستعمل ہے، پہلی مرتبہ تحریف کے معنی میں ہے اور دوسری دفعہ حقیقی مفہوم اور تفسیر کے معنی میں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ﴾ اس مقام پر تأویل سے حقیقی تفسیر مراد ہے، یعنی متشابہ آیات کا اصلی معنی اور حقیقی مفہوم اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔[2]

(3) **تأویل بمعنی انجام و نتیجہ**

ارشاد ربانی ہے: ﴿فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ﴿﴾﴾ (النساء:59)

''اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں اللہ اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔'' امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ﴿وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾ واحسن عاقبة و بآلاً نتیجہ وانجام کے لحاظ سے بہترین۔ یعنی اختلافی معاملات میں کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرف

[1] تفسیر ابن کثیر، 478/1 [2] اس آیت مبارکہ میں قراء کرام کا وقف کرنے میں اختلاف ہے، بعض قراء لفظ جلالہ پر وقف کرتے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا متشابہ آیات کا مفہوم کوئی نہیں جانتا۔ بعض قراء ﴿الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ﴾ پر وقف کرتے ہیں، اس صورت میں معنیٰ یہ ہو گا کہ متشابہ آیات کی حقیقی تفسیر اللہ تعالیٰ اور پختہ کار اہل علم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر ابن کثیر: 480/1

رجوع کرنا سب سے بہتر اور باعتبار انجام سب سے اچھا رویہ ہے۔

(4) تأویل بمعنی خوابوں کی تعبیر

سورہ یوسف کی متعدد آیات میں لفظ تاویل خوابوں کی تعبیر کے لیے مستعمل ہے۔[1]

تجزیہ راقم کے نزدیک لفظ ''تاویل'' کا ترجمہ و تفسیر کرتے ہوئے مترجمین و مفسرینِ قرآن نے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں۔

کہیں تاویل کا معنی تعبیر ہے، کہیں تفسیر و تشریح، کہیں نتیجہ وانجام اور کہیں پر توجیہ لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو لفظ تاویل بنیادی طور پر قرآن مجید میں تفسیر و تشریح کے معنی میں مستعمل ہے۔ اگر وہ تفسیر واقعہ کے مطابق ہے تو اسے ہم حقیقی مفہوم کہہ لیتے ہیں، اگر وہ کسی خواب کی تشریح ہے تو اسے ہم تعبیر کہہ لیتے ہیں، اگر وہ تفسیر حقیقت کے برعکس ہے تو اسے ہم تحریف کہتے ہیں، بنیادی معنیٰ بہر حال تفسیر و تشریح ہی قرار پاتا ہے۔

لفظ تأویل کا احادیث میں استعمال

احادیث میں تاویل کا لفظ درج ذیل معانی میں مستعمل ہے۔

(1) تأویل بمعنی تفسیر

سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ نے فرمایا: ''میں سویا ہوا تھا کہ میرے پاس دودھ کا پیالہ لایا گیا، میں نے خوب پیا، پھر میں نے بچا ہوا عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کو دے دیا۔''

انہوں نے پوچھا: " فَمَا أَوَّلْتَهُ يَا رَسولَ اللّٰهِ؟ قالَ: العِلْمَ" یارسول اللہ! آپ نے اس کی کیا تعبیر فرمائی؟ آپ نے فرمایا: "علم" یہاں تاویل بمعنی تعبیر مستعمل ہے۔[2]

[1]ملاحظہ کیجئے: سورۃ یوسف، آیات نمبر 36،37،44،45،100۔ [2] صحیح البخاري، کتاب التعبیر، باب اللبن، حدیث (7006)، ص 1208، نیز دیکھیے: حدیث: 82، 7007۔

(2) تاویل بمعنی درایت واجتہاد

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نماز دو رکعت فرض ہوئی وہ سفر کی مقرر ہو گئی اور حضر کی پوری کی گئی، امام زہری نے عروہ سے پوچھا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کس وجہ سے پوری نماز پڑھتی ہیں۔ انہوں نے فرمایا: "تَأَوَّلَتْ كَمَا تَأَوَّلَ عُثْمَانَ"، "وہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی طرح اجتہاد کرتی ہیں۔[1] یہاں تاویل سے مراد اجتہادی رائے ہے۔

(2) تأویل بمعنی توجیہہ وتفسیر

سیدنا قتادہ رضی اللہ عنہ ﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"ان ستاروں کو تین وجہ سے پیدا کیا گیا ہے۔ آسمان دنیا کی زینت، شیطانوں کے لیے رجم، راہ نمائی کے لیے علامات و آثار"۔
مزید فرماتے ہیں: "فَمَنْ تَأَوَّلَ فِيْهَا بِغَيْرِ ذَالِكَ أَخْطَاءَ۔۔۔ الخ"[2]"جس نے کوئی اور توجیہہ کی وہ خطا پر ہے۔"

تاویل کا اصطلاحی مفہوم اور تفسیر و تاویل میں فرق

تاویل اور تفسیر باہمی مترادف ہیں یا ان میں کچھ فرق ہے، اگر فرق ہے تو کس نوعیت کا؟ اس پر ہمارے اسلاف نے اتنی مفصل بحثیں کی ہیں کہ ان سب کو نقل کرنا بھی مشکل ہے۔ البتہ ان کی تحقیقات کا ماحصل اور تجزیہ درج ذیل ہے:

(1) لغوی لحاظ سے تفسیر اور تاویل میں واضح اور نمایاں فرق ہے۔ مثلاً:

(الف) "تفسیر" کا مادہ "فسر" ہے، جبکہ تأویل کا مادہ "أول" ہے۔

(ب) تفسیر کے اپنے مستقل معانی اور مواقع استعمالات ہیں جبکہ تأویل کے اپنے مستقل معانی اور مواقع استعمالات ہیں۔ (ج) لغوی لحاظ سے تأویل اور تفسیر میں قدر مشترک ضرور ہے کہ تأویل کے متعدد معانی میں سے ایک معنی تفسیر بھی ہے۔

[1]صحیح البخاري، کتاب التقصیر، باب یقصر اذا خرج من موضعه، حدیث (1090)، ص 175 [2] تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر، 526/4

(2) اصطلاحی لحاظ سے بنیادی طور پر تفسیر و تاویل میں کوئی واقعی اور حقیقی فرق نہیں تھا۔ متقدمین کے ہاں اس لیے دونوں الفاظ ایک دوسرے کی جگہ بکثرت مستعمل تھے۔

متاخرین کے ہاں لفظ تفسیر زیادہ مستعمل ہے اور تاویل نسبتاً بہت کم اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فقہ و اصول فقہ، حدیث و اصول حدیث، علم الکلام و دیگر علوم کے ارتقاء کے ساتھ فقہاء، محدثین اور متکلمین کی لغت میں تاویل بمعنی تفسیر تقریباً متروک ہو گیا اور انہوں نے اپنی علمی و فنی اور اصطلاحی ضروریات کے پیش نظر لفظ "تاویل" کو بطور اصطلاح ایک نئے معنی میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ان سب کے نزدیک تاویل کا جدید فہم یہ قرار پایا: "صرف اللفظ عن المعني الراجح الي المعني المرجوح" لفظ کو غالب و راجح معنی کی بجائے مغلوب و مرجوح معنی کی طرف لے جانا۔ اگر وہ صحیح دلیل کی بنیاد پر ہو تو تاویل صحیح، بصورت دیگر تاویل فاسد ہے۔[1]

اِسی بناء پر جدید فنی ضروریات کے تحت لفظ تاویل بطور اصطلاح اس معنی میں غالب و شائع ہے، حتیٰ کہ بطور اصطلاح اس کا تفسیر کے لیے استعمال نامانوس دکھائی دیتا ہے۔

[1]دیکھئے: التفسیر والمفسرون، الذھبي: 16/1

سائنس اور تفسیر قرآن

سائنس اور قرآن مجید ایک نازک موضوع ہے، اس کے متعلق اہل علم میں دو قسم کی آراء پائی جاتی ہیں۔

مؤیدین

کچھ علماء کرام اس کی تائید میں دلائل دیتے ہیں، جن میں سر فہرست امام غزالی کا نام ہے۔ بعض محققین کی رائے کے مطابق پانچویں صدی ہجری کے اواخر میں اس موضوع (تفسیر قرآن اور جدید علوم پر) مستقلاً علماء نے غور و خوض شروع کیا۔[1]

مؤیدین میں امام غزالی[2] متوفی (505ھ)، رازی[3] متوفی (606ھ)، زرکشی متوفی (794ھ) سیوطی متوفی (911ھ) کے نام سر فہرست ہیں۔ [4]

[1]ملاحظہ ہو: التفسیر، معالم حیاته، أمین الخولي، ص 20، التفسیر والمفسرون، محمد حسین الذھبي: 140/3، لمحات في علوم القرآن، محمد الصباغ، ص 203، اتجاھات التفسیر في العصر الراھن، عبدالمجید المحتسب، ص 247، اتجاھات التفسیر في القرآن الرابع عشر، فھد الرومي: 550/2 [2] امام غزالی نے اپنی تصنیف، جوہر القرآن میں اس پر مستقل لکھا ہے کہ تمام علوم قرآن مجید سے منشعب ہوتے ہیں۔ (جواھر القرآن، غزالي، مکتبة الجندي، مصر) اس پر تبصرہ کے لیے ملاحظہ ہو: التفسیر والمفسرون، للذھبي: 333332/2، اتجاھات التفسیر في القرن الرابع عشر، فھد الرومي، 556/2 [3] رازی کی تفسیر کبیر ان کے مؤقف کے لیے شاہد عدل ہے، کیونکہ انھوں نے اس نظریہ کو اپنی تفسیر میں عملاً اختیار کیا ہے۔ [4] زرکشی اور سیوطی کے تائیدی بیانات کے لیے ملاحظہ ہو: اتجاھات التفسیر في القرن الرابع عشر، فھد الرومي: 558557/2

معارضین

کچھ اہل علم اس کے برعکس دلائل دیتے ہیں، چنانچہ امام شاطبی متوفی 790ھ [1] اور امام ابو حیان اندلسی متوفی 745ھ [2]کا نام مخالفین میں سرفہرست ہے۔

جمہور مفسرین کرام اور امام طبری، قرطبی، ابن کثیر و دیگر کبار مفسرین کی تفاسیر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اسے عملی طور پر کم از کم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

معتدل رائے

اس بارے میں متوازن اور معتدل رائے یہ ہے کہ

(1) قرآن مجید کی سائنسی تفسیر اور سائنسی اعجاز میں فرق کرنا ضروری ہے۔

(2) قرآن مجید کا سائنسی اعجاز یہ ہے کہ قرآن مجید نے آفاق و انفس، نجوم و کواکب، ارض و سماء، نباتات و اشجار وغیرہ کے بارے میں کئی حقائق تربیتی و روحانی نقطہ نظر سے پیش کیے ہیں۔ پوری سائنسی تاریخ میں کوئی ثابت شدہ حقیقت قرآنی بیانات کو غلط ثابت نہیں کر سکی اور نہ ہی کر سکتی ہے۔ بلکہ سائنسی ترقی قرآن مجید کے ثابت شدہ حقائق کے کسی پہلو کو مزید نکھارتی اور مبرہن کرتی ہے۔

قرآن مجید کی اس معجزانہ حیثیت پر تمام قدیم وجدید علماء متفق نظر آتے ہیں اور اس بارے میں کوئی مخالف رائے منقول نہیں ہے۔[3] یہ سائنسی اعجاز ہے۔

(3) سائنسی تفسیر یہ ہے کہ کسی ایجاد، دریافت، سائنسی نظریہ یا تجربہ وغیرہ کے بارے میں رائے دینا کہ یہ نصِ قرآن کا مدلول ہے۔[4]

(4) سائنسی تفسیر کرتے ہوئے اگر درج ذیل شروط پیشِ نظر رکھی جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

[1]ملاحظہ ہو: الاعتصام، للشاطبي [2] البحر المحيط: 341/1 [3] معجزة القرآن، محمد متولي الشعراوي: 217/2، اتجاهات التفسير في القرن الرابع عشر، 601600/2 [4] مناهج البحث في العقيده الاسلاميه في العصر الحاضر، عبدالرحمان، ص159158

سائنسی تفسیر کی شروط

(1) سب سے اہم شرط یہ ہے کہ سائنس یا سائنسی تفسیر کو قرآن مجید کا ہدف و مقصد قرار نہ دیا جائے اور یہ ہمیشہ پیش نظر رہے کہ قرآن مجید بنیادی طور پر نہ سائنس کی کتاب ہے اور نہ ہی سائنس براہ راست اس کا موضوع ہے۔

(2) قرآن مجید خالقِ کائنات کا کلام ہے، اس کی تعلیمات و بیانات اپنی جگہ اٹل اور ناقابل تغیر و تبدل ہیں۔ اس کے برعکس سائنس جو مطالعہ قدرت سے عبارت ہے، جو نظریہ پیش کرتی ہے اس میں استقلال و جماؤ نہیں ہوتا، تجربات سے نظریے میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ تجربہ کرنے سے سائنس دان اپنا ایک نظریہ پیش کرتا ہے، دوسرا سائنسدان آتا ہے اور اپنے جدید تجربات سے اس نظریہ کی تردید کر دیتا ہے۔ سائنسی نظریات غیر اٹل اور تغیر پذیر ہوتے ہیں، ایسی صورت میں قرآن اور سائنسی نظریے کے درمیان تطابق صحیح نہیں ہوگا اور نہ سائنسی نظریے سے قرآن کے کسی بیان کی تردید کرسکتے ہیں۔

(3) قرآن کریم کی حقانیت و صداقت کے لیے کسی بیان و تائید کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو اس ذاتِ باری تعالیٰ کا کلام ہے جو تمام سچائیوں کا سرچشمہ ہے۔ اسے نہ کسی تصدیق کرنے والے کی تصدیق کی ضرورت ہے اور نہ کسی مؤید کی تائید کی حاجت، اگر کسی سائنسی مشاہدہ اور قرآنی بیان کے درمیان مطابقت پائی جائے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس سے قرآن کی تائید ہوتی ہے، بلکہ یوں کہا جائے گا کہ اس کی طرف قرآن سے اشارہ ملتا ہے، یا قرآنی استنباط سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

(4) قرآنی بیان اور سائنسی نظریے یا مشاہدے کے درمیان تطابق نہ پایا جائے تو قرآن کے بیان کی غلط یا دور دراز کی تاویل کرنے کی بجائے انسانی علم و عقل اور مشاہدے کو ناقص سمجھا جائے گا اور یقین کرلیا جائے گا کہ ابھی قرآنی حقیقت تک پہنچنے کے لیے مزید علم و تحقیق کی ضرورت ہے اور موجودہ علم اسے سمجھنے میں ناکام ہوا ہے۔[1]

(5) کسی بھی جدید سائنسی نظریے یا جدید سائنسی مشاہدے کو قرآن مجید کا عین مدلول نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ اس سے خود صاحبِ قرآن، صحابہ کرام اور اسلافِ امت کے فہم قرآن پر حرف آتا ہے اور یہ تمام عرب امیین کے فہم کے بھی منافی ہے۔ نیز قرآن مجید کے بنیادی مقصد نزول کے بھی خلاف ہے۔

مولانا عبد المالک کاندھلوی لکھتے ہیں:

''قرآن نہ ہوائی، جہاز اور راکٹوں کی صنعت سکھانے کے لیے نازل ہوا ہے، اور نہ اس کی تعلیم مقصدِ رسالت ہے، بلکہ مقصد وحی اور غرض رسالت تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفوس ہے۔'' [2]

سائنسی نظریے کو مدلول قرآن ثابت کرنے کی تردید کرتے ہوئے مولانا عبد المالک کاندھلوی مزید لکھتے ہیں:

''اگر اور کوئی نقصان سمجھ میں نہیں آتا تو سب سے بڑھ کر یہ نقصان تو سرسری نظر سے ہی معلوم ہو جائے گا اور یہ قباحت لازم آئے گی کہ اس معیار پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی زندگیاں ہی قرآنی مضامین سے بالکل بے تعلق نظر آئیں گی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو کسی مجلس میں ان صنعتی ترقیات کو بیان فرمایا اور نہ ہی صحابہ نے ان کو کبھی ذکر کیا۔ نہ سیدنا ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابہ

سے یہ مضامین نقل کیے گئے۔" تو سوچیے کہ اگر ان مضامین کا نام "علوم القرآن" قرار دیا جائے تو کیا یہ لازم نہیں آئے گا کہ علوم القرآن سب سے زیادہ ناواقف یہی حضرات تھے؟[3]

[1]یہ تمام شرائط مولانا عزیز اللہ اعظمی کی بیان کردہ ہیں۔ ملاحظہ ہو: ''سائنس اور مطالعہ قرآن'' عزیز اللہ اعظمی، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، دسمبر 1985، ص 31-32
[2] التحرير في أصول التفسير: ص 97 [3] التحرير في أصول التفسير: ص 98

مزید لکھتے ہیں:

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ خداوند عالم نے بلاوجہ قرآن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا اور صحابہ کو اس کا اولین مخاطب بنایا۔ اچھا ہوتا لندن کی کسی یونیورسٹی کے فلاسفر پر اترتا۔" العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ" بظاہر ممکن نہیں کہ کوئی مسلمان یہ سوچنے کی بھی جراءت کر سکے۔"

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں: "

جدید تحقیقات اور سائنسی ترقیات کو مقصد کائنات کا دلفریب عنوان دے کر، مضامین قرآن میں داخل کرنے والوں کے طرز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو قرآن کا موضوع ہی معلوم نہیں۔ قرآن نہ تو فلسفہ ہے اور نہ سائنس کی کوئی کتاب ہے، نہ تاریخ و جغرافیہ ہے وہ تو طبِ روحانی کی آخری اور بے مثال کتاب ہے، جس میں روحانی امراض کے علاج کو بیان کیا گیا ہے۔" [1]

(5) اگر قرآن مجید نے کسی حقیقت کو بیان کیا ہو اور سلف سے تفسیر ثابت شدہ ہو اور جدید سائنس سے اسی تفسیر کے مطابق اس کی مزید تفصیلات یا دقائق و حقائق معلوم ہو جائیں۔ تو ایسی جدید معلومات کو تفسیرِ قرآن میں پیش کرنا، نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔[2]

اس صورت میں بھی اسے قرآنی آیت کا مدلول نہیں کہا جائے گا، مدلول تو وہی ہے جو آثار و اقوال اور لغت سے ثابت شدہ ہے اور پہلے سے معلوم ہے، جدید سائنسی معلومات اس مدلول میں توسیع سمجھی جائیں گی۔[3]

علی سبیل المثال

(1) فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا﴾ (الفرقان:2) "اور جس

[1]التحرير في أصول التفسير: ص 99 [2] مناهج البحث في العقيده الاسلاميه في العصر الحاضر، د۔عبدالرحمان، ص 159185۔ اتجاهات التفسير، فهد الرومي، 597/2 [3] اتجاهات التفسير في القرن الرابع عشر، فهد الرومي، 604/2

نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کا ایک اندازہ ٹھہرایا۔" اس آیت کے مفہوم میں جدید دقیق حقائق تفصیلات بیان کرتے ہوئے جدید سائنسی معلومات بیان کرنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج نہیں، بلکہ یہ مطلوب و محمود ہے۔[1]

فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ﴾ (البقرۃ:222) اس آیت کی تشریح میں "أَذًى" کی مزید تفصیل کرتے ہوئے جدید میڈیکل سائنس کی روشنی میں دورانِ حیض مباشرت کے نقصانات وغیرہ بیان کرنا بالکل جائز بلکہ مطلوب ہے۔[2]

مولانا تقی عثمانی کا جامع تبصرہ

سائنس اور تفسیر قرآن کے حوالے سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں مولانا تقی عثمانی کا جامع، پر مغز اور درد مندانہ تبصرہ انہی کے الفاظ میں نقل کر دیا جائے۔ مولانا تقی عثمانی تفسیر قرآن میں گمراہی کے اسباب میں تیسرا سبب زمانے کے افکار سے مرعوبیت کو قرار دیتے ہیں۔ اس حوالے سے جو کچھ انہوں نے اپنے زوردار قلم سے لکھا ہے، سرسید اور ان کے ہم نوا منحرفین کے طرز تفسیر پر ایک بہترین تبصرہ ہے۔ مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں:

تفسیرِ قرآن کے سلسلے میں تیسری گمراہی یہ ہے کہ انسان اپنے وقت کے فلسفیانہ اور عقلی نظریات سے ذہنی طور پر مرعوب ہو کر قرآن کریم کی طرف رجوع کرے اور تفسیرِ قرآن کے معاملے میں ان نظریات کو حق و باطل کا معیار قرار دے دے، یہ گمراہی دراصل دوسری گمراہی کے ذیل میں خود بخود آ جاتی ہے، لیکن چونکہ ہمارے زمانے میں مغربی افکار سے مرعوبیت نے خاص طور سے بڑی قیامت ڈھائی ہے، اس لیے یہاں اس گمراہی کو مستقل طور سے ذکر کیا جارہا ہے۔

[1]اتجاهات التفسير، فهد الرومي: 597/2 [2] اتجاهات التفسير، فهد الرومي: 618/2

تاریخِ اسلام کے ہر دور میں ایسے افراد کی ایک جماعت موجود رہی ہے، جو قرآن و سنت کے علوم میں پختگی پیدا کیے بغیر اپنے زمانے کے فلسفے کی طرف متوجہ ہوئے اور وہ فلسفہ ان کے ذہنوں پر ایسا بری مسلط ہو گیا کہ وہ اس کے بتائے ہوئے فکر و نظر کے دائروں سے باہر نکلنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہو گئے، اس کے بعد جب انہوں نے قرآن کریم کی طرف رجوع کیا اور اس کی بہت سی باتیں انہیں اپنے آئیڈیل فلسفے کے خلاف محسوس ہوئیں تو انہوں نے اس فلسفے کو جھٹلانے کے بجائے قرآن کریم میں تحریف و ترمیم شروع کر دی اور اس کے الفاظ کو کھینچ تان کر اپنے فلسفیانہ افکار کے مطابق بنانا شروع کر دیا۔ جب مسلمانوں میں یونانی فلسفے کا چرچا ہوا اور لوگوں نے قرآن و سنت کے علوم میں پختگی پیدا کیے بغیر اس فلسفے کو حاصل کرنا شروع کیا، تو یہی فتنہ پیش آیا اور بعض لوگ جو یونانی فلسفے سے بری طرح مرعوب ہو گئے تھے، قرآن کریم کو توڑ موڑ کر اس فلسفے کے مطابق بنانے کی کوشش میں لگ گئے۔ ان میں بہت سے لوگ مخلص بھی تھے اور سچے دل سے یہ سمجھتے تھے کہ یونانی فلسفہ ناقابل تردید ہے اور قرآن و سنت کی متوارث تفسیر اس کے لائے ہوئے فکری سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکے گی، اس لیے اس تفسیر کو بدل کر قرآن و سنت کی ایسی تشریح کرنی چاہیے جو یونانی فلسفے کے مطابق ہو، لیکن درحقیقت یہ ان کی قرآن و سنت اور اسلام کے ساتھ ایک نادان دوستی تھی، جس نے اسلام کی کوئی خدمت کرنے کے بجائے مسلمانوں میں نظریاتی انتشار برپا کیا اور معتزلہ اور جہمیہ جیسے بہت سے نئے فرقے پیدا کر دیئے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پختہ کار علمائے دین جنہیں قرآن و سنت کے علوم میں رسوخ تھا اور جو قرآن و سنت کے مقابلے میں وقت کے کسی چلے ہوئے نظام فکر سے مرعوب نہیں تھے، ان کی ایک بڑی جماعت کو دوسرے کام چھوڑ کر ایسے لوگوں کی تردید میں مصروف ہو جانا پڑا اور انہوں نے یونانی فلسفے کی فکری غلطیوں کی نشاندہی کر کے ایسے لوگوں کی مدلل اور مفصل تردید کی جو اس فلسفے کے اثر سے قرآن و سنت میں معنوی تحریف کے مرتکب ہوئے تھے، غرض ایک عرصے تک فکری مباحث اور تصنیف و مناظرہ کا بازار گرم رہا اور فریقین کی طرف سے اپنے اپنے مؤقف کی تائید میں پورے کتب خانے تیار ہو گئے۔ پختہ کار علماء دین کا مؤقف یہ تھا کہ قرآن کریم کسی انسان کی نہیں اس خالقِ کائنات کی کتاب ہے جو اس دنیا اور اس میں ہونے والے واقعات کی رتی رتی سے باخبر ہے اور اس دنیا کے بدلتے ہوئے حالات سے اس سے زیادہ کوئی باخبر نہیں ہو سکتا، لہٰذا قرآن کریم کی تعلیمات اور اس کے بیان کردہ حقائق سدا بہار اور ناقابلِ ترمیم ہیں، جن احکام و قوانین اور نظریات پر زمانے کی تبدیلی اثر انداز ہو سکتی تھی، ان کے بارے میں قرآن کریم نے خود کوئی معین بات کہنے کے بجائے ایسے جامع اصول بیان فرما دیے ہیں جو ہر تبدیلی کے موقع پر کام آ سکیں اور ان کی روشنی میں ہر بدلے ہوئے ماحول میں راہ نمائی حاصل کی جا سکے، لیکن جو باتیں قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ بیان فرما دی ہیں یا جن کی واضح تفسیر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، وہ زمانے کی تبدیلی سے بدلنے والی باتیں نہیں ہیں۔

فلسفہ اور سائنس کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس کے وہ بیشتر نظریات جو قطعی مشاہدے پر مبنی نہیں ہیں، مختلف زمانوں میں بدلتے رہے ہیں اور جس زمانے میں جو نظریہ رائج رہا وہ لوگوں کے ذہن فکر پر اس بری طرح چھا گیا کہ لوگ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے، لیکن جب زمانے کے کسی انقلاب نے اس نظریے کی کایا پلٹی تو وہی نظریہ اتنا بدنام ہوا کہ اس کو منہ سے نکالنا بھی دقیانوسیت کی علامت بن گیا، اب اس کی جگہ کسی نئے نظریے نے ذہنوں پر اپنا سکہ بٹھایا اور اس کی گھن گرج نے ہر مخالف رائے کا گلا گھونٹ دیا، پھر ایک عرصہ گزرنے پر یہ نیا نظریہ بھی اپنی آن بان کھو بیٹھا اور کسی تیسرے نظریے نے اس کی جگہ لے لی، فکر انسان کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے اور جب تک حقیقت کی تلاش انسان کو قطعی مشاہدے تک نہیں پہنچا دیتی اس وقت تک یہی ہوتا رہے گا، اس کے برخلاف قرآن کریم نے جن حقائق کی طرف واضح راہ نمائی فرمائی ہے، وہ چونکہ ایک ایسی ذات کے بیان کیے ہوئے ہیں جس کے سامنے یہ پوری کائنات اور اس میں ہونے والے حوادث ہاتھ کی ہتھیلی سے زیادہ واضح اور

بے غبار ہیں، اس لیے فکر اور فلسفے کی اس آنکھ مچولی کو اس کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا، آپ زمانے کے جس نظریہ سے مرعوب ہو کر قرآن کریم کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے، ہو سکتا ہے کہ وہی نظریہ عہدِ جہالت کی یادگار ثابت ہو اور آپ اسے زبان پر لاتے ہوئے بھی شرمانے لگیں۔

راسخ العقیدہ اہل علم کا یہ طرزِ فکر تجربے سے بالکل سچا ثابت ہوا، آج فلسفہ اور سائنس کی ترقیات نے یونانی فلسفے کی دھجیاں بکھیر دی ہیں اور اس کے نہ صرف بہت سے طبعی، عنصری اور فلکیاتی نظریات غلط قرار پا گئے۔ بلکہ ان کی بنیاد پر مابعد الطبیعی (Metaphysical) نظریات کی جو عمارت اٹھائی گئی تھی وہ بھی زمین بوس ہو چکی ہے، جن لوگوں نے یونانی فلسفے کی چمک دمک سے خیرہ ہو کر قرآن و سنت کو موم کی ناک بنایا تھا، آج اگر وہ زندہ ہوتے تو یقیناً ان کی ندامت و شرمندگی کی کوئی انتہا نہ رہتی۔

لیکن حیرت ہے کہ سطحیت پرستوں کا ایک گروہ تاریخ سے کوئی سبق لینے کے بجائے مغربی افکار سے متأثر مرعوب ہو کر قرآن و سنت کی ایسی تفسیر گھڑنے کی فکر میں ہے، جو مغرب کے چلے ہوئے نظریات پر فٹ ہو سکے۔ یہ گروہ تفسیر کے تمام معقول اور معروف اصولوں کو توڑ کر صرف ایک اصول کی بنیاد پر قرآن کریم کے ساتھ مشقِ ستم میں مصروف ہے اور وہ اصول یہ ہے کہ اللہ کے اس کلام کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر مغربی افکار کے مطابق بنادیا جائے۔ یہ لوگ کبھی یہ سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ جس کلام پر وہ تاویل و تحریف کی مشق کر رہے ہیں وہ کس کا کلام ہے؟ جن نظریات کی وہ خاطر وہ اللہ کے کلام میں کھینچا تانی کر رہے ہیں وہ کتنے پائیدار ہیں؟ اور جب انسانی فکر کا قافلہ ان نظریات کو روند کر آگے بڑھے گا تو اس قسم کی تفسیروں اور تشریحات کا کیا حشر ہو گا؟[1]

[1]علوم القرآن، تقي عثماني: ص 372-376

اس کتاب کی تکمیل اللہ کے فضل اور رحمت خاص سے بروز جمعرات 14 شعبان المعظم ۱۴۴۶ ہجری بمطابق ۱۳اکتوبر ۲۰۲۵ صبح ۱۰:۴۸ پر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس محنت کو اپنی بارگاہ عالیہ میں قبول فرمائے اور اس کتاب کو ہمارے لیے نافع بنائے۔ (آمین (واخر دعونا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

ابو عطاء المنعم رضاء اللہ بن الحاج خان بادشاہ حفظہ اللہ حالانزیل شریف آباد

فھرس الکتاب

1	پیش لفظ	2
2	۔حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔۔	4
3	چہرہ مہرہ۔۔۔۔۔اسلام کے زیر سایہ	5
4	رفیق سفر	9
5	حیات نبوی میں نماز کی امامت	12
6	بیعتِ خلافت	13
7	جمع صدیقی... اسباب و منہج	15
8	اسلوب و منہج:	16
9	رسم عثمانی کی توقیفیت	19
10	پ مذکورہ مذاہب ثلاثہ کے دلائل پہلے مذہب کے دلائل:	19

11	دوسری جہت: کتابت:	20
12	فعل صحابہ۔۔۔۔اجماع:	22
13	کلمہ میں وارد اَوجہ قراءات کی طرف اشارہ:۔۔۔۔بعض عرب لغات پر دلالت	24
14	اتصال سند:۔۔۔۔۔اَصل حرکت پر دلالت۔۔اَصل حرف پر دلالت:۔۔۔بعض دقیق معانی پر دلالت	25
15	بعض معانی مختلفہ کی افادیت۔۔	27
16	تیسرے مذہب کے دلائل	30

17	حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ	32
18	عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں	40
19	حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ	48
20	حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور بیعت رضوان	54
21	حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ	58
22	مدینہ منورہ میں آمد	60
23	قرآنِ مجید میں اوامر واحکامات ۔منکرات وممنوعات	68
24	کتمانِ علم۔۔۔باعثِ لعنت اور عذاب کا سبب ہے:	74

25	اسباب نزول	87
26	نزول آیات کے متعلق علماء کے اقوال۔۔۔ عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ	93
27	اسباب نزول	102
28	اسباب نزول	104
29	فوائد واسباق	110
30	ذرا غور فرمایئے	112
31	تتمہّ	114

32	ابو جہل (عمرو بن ہشام)	116

33	ابو جہل کی ہلاکت	125
34	سببِ نزول	127
35	ابو جہل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کا معترف تھا	130
36	دائمی مشعل	132
37۔	آیات کا سببِ نزول	134
38	آثار و اسباق	136
39	تاویل اور تفسیر	140
40	قرآن مجید میں لفظ تأویل کے استعمالات	141
41	لفظ تأویل کا احادیث میں استعمال	143

42	تاویل کا اصطلاحی مفہوم اور تفسیر و تاویل میں فرق	144
43	سائنس اور تفسیر قرآن	145
44	علی سبیل المثال	148
45	مولانا تقی عثمانی کا جامع تبصرہ	149